مسعود حسن رضوی ادیب

حیات و خدمات

مؤلفہ

مرزا جعفر حسین ایڈووکیٹ

ناشر

نیر اکیڈمی، اقبال منزل، لکھنؤ

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

سن اشاعت ۱۹۷۷ء

طابع .. .. نامی پریس لکھنؤ

تعداد ۵۰۰

قیمت .. .. ۱۵ روپے

صفحہ تعارف

نام۔ مرزا جعفر حسین تمکین

وطن۔ فیض آباد۔ سکونت لکھنؤ از ۱۹۱۵ء تا حال

پیدائش۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۹۹ء

تعلیم۔ بی اے ۱۹۲۳ء ایل ایل بی ۱۹۲۶ء

ادبی خدمات۔ متاع غالب، غالب کی فارسی غزلیات کا انتخاب اور

شعرائے ایران کی ہم طرح غزلیں

متعدد اردو اور انگریزی اخباروں کی ادارت

اردو اور انگریزی رسالوں اور اخباروں میں کثیر التعداد مضامین

پرانی یادیں۔ مجموعۂ مضامین۔ زیر طبع

مسعود حسن رضوی ادیب

حیات و خدمات

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب
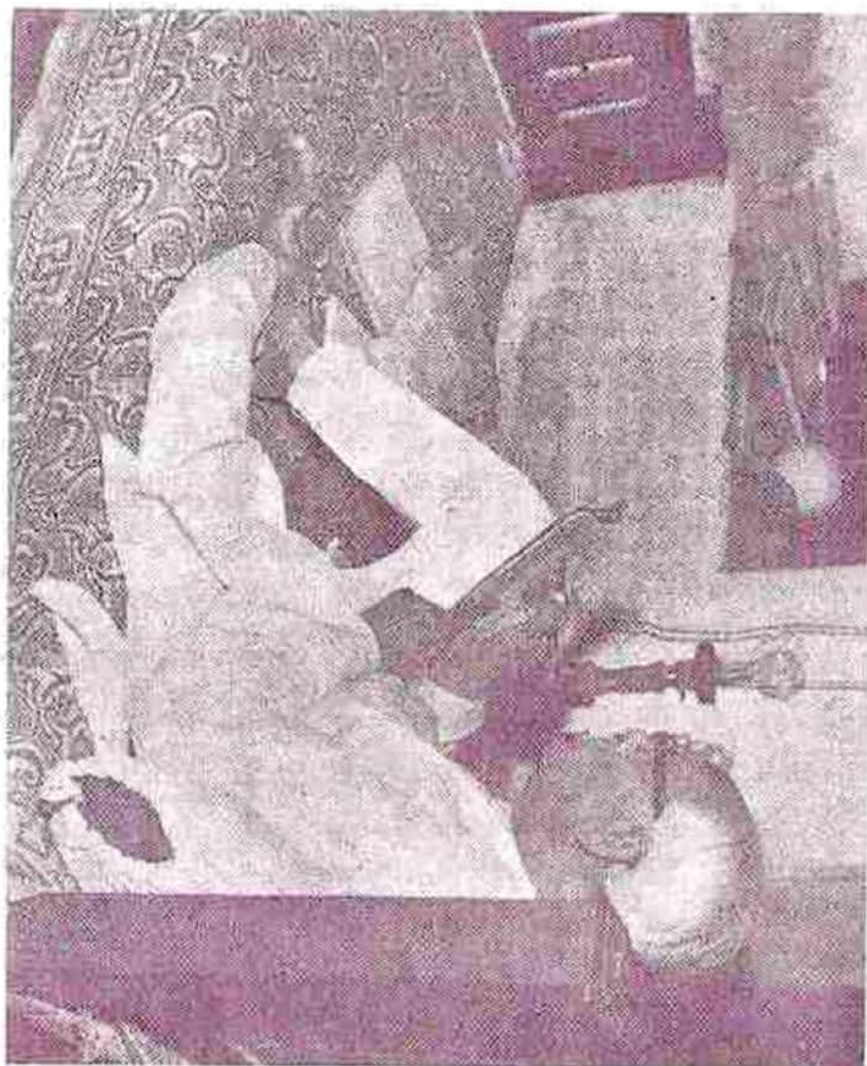
پیش گفت

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی سے میری ملاقات کی ابتدا ۱۹۱۵ء میں ہوئی جب میں نویں درجے میں پڑھتا تھا اور وہ بی۔ اے کلاس میں تھے۔ ہم دونوں آٹھ نو مہینے امامیہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم رہے اور اسی زمانے سے مسعود صاحب کی انسانیت، شرافت، سنجیدگی، ذہانت، ذکاوت، حسن کردار، بلندیِ اخلاق اور علمی شغف کا سکہ نہ صرف میرے دل پر بلکہ تمام دوسرے طالب علموں کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا۔ ہم سب ان کا اسی زمانے سے ادب لحاظ کرتے تھے اور تعلیمی نیز تفریحی مشاغل میں انھیں سے مشورے حاصل کرتے تھے۔ ان کی اصابت رائے کے ہم سب قائل تھے۔ حالانکہ اس بورڈنگ ہاؤس میں کئی طالب علم مسعود صاحب سے عمر میں بڑے یا ان کے ہم سن تھے اور وہ بھی بی۔ اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ سب فارغ التحصیل ہو کر ادھر ادھر چلے گئے لیکن میرا مستقل قیام لکھنؤ میں رہا اور اب تک ہے اور مسعود صاحب سے میرے تعلقات اب تک اسی طرح برقرار ہیں۔

موصوف کی طالب علمی سے لے کر آج تک کے حالات سے واقفیت رکھنے والا کوئی دوسرا شخص میرے سوا موجود نہیں ہے۔ آپ کی حیات اور ادبی خدمات کو قلم بند کرنا ایک مدت سے میری دلی خواہش بلکہ شوق تھا۔ حسن اتفاق سے ڈاکٹر صفدر آہ صاحب کا مقالہ مسعود حسن ادیب بحیثیت محقق نظر سے گزرا، جس کا آخری حصہ "سمند شوق پر تازیانہ ہوا" موصوف نے لکھا ہے:

> "ادیب صاحب اس عہد کے مستند محقق اور عالم ادب ہیں۔ ان کی خاموش عظیم خدمات اور ان کی سراپا محبت اور سراپا شرافت شخصیت کو اس مضمون میں پیش کرنا ناممکن تھا۔ اس وقت قدیم لکھنوی تہذیب و ثقافت کے وہ واحد نمائندے لکھنؤ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کاش ان پر ایک مستقل تصنیف جلد سامنے آ سکے۔"

میری زیر تصنیف کتاب موصوف کی اس تمنا کو عملی شکل دینے کی امکانی کوشش ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب

پہلا حصّہ

حیات

عینی شاہدوں اور معتبر واقف کاروں کے بیانات

فہرست مضامین

دیباچہ

مسعود صاحب کے حالات زندگی کے معتبر ماخذ وہ بیانات ہیں جو ان سے سالہاسال کی ذاتی واقفیت رکھنے والے اہلِ قلم نے لکھے ہیں۔ یہ بیانات طویل وقفوں کے بعد لکھے گئے ہیں اور مسعود صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں۔ ان بیانات پر نظر کرتے وقت ان کے زمانۂ تحریر کو نظر میں رکھنا اشد ضروری ہے۔ ورنہ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا قوی امکان رہے گا۔ ذیل میں ان بیانات کی نشاندہی اُن کے عنوان اور محل وقوع کے ساتھ کی جاتی ہے۔

سیّد مسعود حسن رضوی ایم۔اے متخلص بہ ادیب۔ خود نوشت سوانح عمری، من کیستم، ستمبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۶۹-۷۲ اردو، فارسی، عربی، انگریزی ادب سے بخوبی واقف، متعدد کتابوں کے مصنّف اور مترجم مرزا محمد عسکری کے قلم سے۔

الباقیات الصّالحات۔ روزنامۂ حقیقت، لکھنؤ، ۲۴/۲۵ مئی ۱۹۵۳ء۔ پختہ کار جرنلسٹ، اڈیٹر و مالک اخبار حقیقت انیس احمد عباسی کے قلم سے

موجودہ لکھنوی ادیب۔ ماہ نامہ فروغ اردو، لکھنؤ جون ۱۹۵۷ء۔ ڈاکٹر نور الحسن

ہاشمی صدر شعبۂ اردو فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی کے قلم سے۔
آپ سے ملیے۔ ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۶ء۔ نکتہ رس ادیب اور بے باک نقاد سید علی جواد زیدی کے قلم سے۔ زیدی صاحب نے متعدد عالموں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں سے مل کر اپنے تاثرات "آپ سے ملیے" کے عنوان سے لکھ کر ایک سلسلۂ مضامین ماہ نامہ نیا دور میں شایع کیا تھا۔ چھ سات برس کے بعد ۱۹۶۳ء میں یہ مضامین چند نئے مضمونوں کے ساتھ کتابی شکل میں شایع کر دیے۔ کتاب کا نام "آپ سے ملیے" ہی رہا۔
مسعود حسن رضوی۔ ماہ نامہ نقوش، لاہور، شخصیات نمبر حصہ دوم، اکتوبر ۱۹۵۶ء۔ مشہور ادیب و افسانہ نگار سید علی عباس حسینی کے قلم سے۔
مسعود حسن ادیب بحیثیت محقق۔ ماہ نامہ کتاب، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۸ء۔ بلند پایہ مصنف شاعر و نقاد ڈاکٹر صفدر آہ کے قلم سے۔

اس کتاب میں ان ادیبوں کے جو اقوال پیش کیے گئے ہیں وہ بیشتر اُن کے انھیں بیانات سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ہر جگہ ان کا حوالہ دینا ضروری نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ اگر اُن کا کوئی اور بیان یا کسی اور کا کوئی بیان پیش کیا جائے گا تو اس کے ماخذ کا حوالہ دیا جائے گا۔

مسعود صاحب سے اِن ادیبوں کی واقفیت کی مدت اُن کے حسب ذیل بیانات سے معلوم ہوتی ہے۔
مرزا محمد عسکری:۔ اپنی سوانح عمری "من کیستم" میں تحریر فرماتے ہیں "اب وقت تحریر سطور ہذا ستمبر ۱۹۴۳ء ہے تہتر واں سال ہے" (صفحہ ۵۶)۔ گلدستۂ احباب کے ذیل میں مسعود صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں "مجھ سے آپ سے بیس بائیس برس سے دوستی ہے۔ اگر مجھ کو قدرت حاصل ہوتی تو میں آپ کو صادق الوداد کا خطاب دیتا" صفحہ ۷۱-۷۲

انیس احمد عباسی :- "راقم السطور سے مسعود صاحب کی شناسائی آج سے چوبیس پچیس سال قبل پہلی دفعہ گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کے یہاں ہوئی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی لائبریری کے افتتاح کی تقریب کی تھی جس میں لکھنؤ، اعظم گڑھ، علی گڑھ اور حیدر آباد سے اہلِ علم کو مدعو کیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی :- ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک دو سال بی۔ اے کے درجے میں مسعود صاحب کے طالب علم رہے اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۴ء تک یونیورسٹی میں رفیق کار رہے۔ یعنی مضمون متذکرۂ بالا کو لکھتے وقت ان کی مسعود صاحب سے واقفیت کو تیئیس (۲۳) برس اور قریبی تعلق کو نو برس ہو چکے تھے۔

سیّد علی جواد زیدی :- "میں نے مسعود صاحب کو سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں علی عباس حسینی کے یہاں دیکھا تھا۔ اس وقت آپ کا سن اڑتیس برس کا تھا۔ اس پہلی ملاقات کو اب چوبیس برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں میں نے آپ کو بار بار دیکھا۔ دو برس تک بی۔ اے میں آپ سے فارسی بھی پڑھی۔ آپ سے ادبی محفلوں میں ملاقاتیں بھی ہوئیں، دوستوں کے یہاں نیاز حاصل ہوا، خود آپ کے دولت کدے پر کئی بار حاضری دی۔"

سیّد علی عباس حسینی :- "میں مسعود صاحب کو ان سب سے پہلے سے جانتا ہوں۔ ۱۹۱۵ء میں جب میں ایف۔ اے کی تعلیم کے لیے آیا تو وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے اور ہم دونوں شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔"

ڈاکٹر صفدر آہ :- "ادیب صاحب سے میں چالیس سال سے واقف ہوں۔ اس طویل مدت میں میں نے بارہا دیکھا ہے کہ علمی اور ادبی مسائل کے علاوہ بھی اور ذاتی معاملات میں بھی جو رائے انھوں نے دی وہ ہمیشہ مناسب اور درست رہی۔ اس کا سبب

صرف یہ ہے کہ ان کی طبع سلیم اور حکیمانہ ذہن ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں حقیقتِ معاملہ فوراً منعکس ہو جاتی ہے۔"

اتنی اتنی طویل مدتوں کی ذاتی واقفیت کے بعد معتبر ادیبوں نے جو بیانات شایع کیے ہیں مسعود صاحب کے حالات زندگی کے لیے ان سے زیادہ مستند ماخذ اور کیا ہو سکتے ہیں۔ راقم حروف نے بیشتر انھیں بیانات کو مناسب ترتیب سے مختلف عنوانات کے ذیل میں پیش کر دیا ہے۔ اپنے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو لکھنے سے تا امکان اجتناب کیا ہے تاکہ جنبہ داری کا الزام نہ لگایا جاسکے۔

ان بیانات کے علاوہ معروف و مقبول مزاح نگار شوکت تھانوی کے ایک مقالے کا کہیں کہیں حوالہ دیا جائے گا۔ یہ مقالہ 'لکھنؤ کی چند علمی و ادبی شخصیتیں' کے عنوان سے ماہنامہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر حصہ اول میں جنوری ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا تھا۔ اس میں تمہید کے طور پر مقالہ نگار نے لکھا تھا "خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے' یہ مصرع جب سے کہا گیا ہے اس وقت سے لکھنؤ کے ہر دور میں دہرایا گیا ہے۔ تقسیم ملک سے بھی دو سال قبل (۱۹۴۵ء میں) مجھ کو وہ لکھنؤ چھوڑ دینا پڑا جو اجڑتے اجڑتے بھی ایسا ضرور تھا کہ اس کو اس انحطاط کے باوجود 'پھر غنیمت ہے' کہا جا سکتا تھا اور اس کے آباد رہنے کی دعائیں مانگی جا سکتی تھیں۔" اس تمہید کے بعد لکھنؤ کی جن علمی و ادبی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے ان میں پروفیسر مسعود حسن ادیب بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مقالہ نگار کی ذاتی واقفیت ۱۹۴۵ء تک کے مسعود صاحب سے ہے۔

ہمارے معتبر ماخذوں میں تین ملاقاتیں بھی ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور مسٹر جی۔ ایم شاہ نے مسعود صاحب سے ملاقات کر کے ان کے مشغلوں اور کارناموں وغیرہ کے بارے میں سوال پوچھے اور مسعود صاحب نے جواب دیے۔ اس طرح بہت سی باتیں خود مسعود صاحب کے بیان سے معلوم ہوئیں۔ یہ سوال و جواب

مناسب موقعوں پر پیش کیے جائیں گے۔ یہ ملاقاتیں بالترتیب ۲۸ جون سنہ ۱۹۶۱ء، ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء اور ۲۶ فروری سنہ ۱۹۶۷ء کو لکھنؤ ریڈیو سے نشر کی گئیں۔

مکتوب ادیب | حالات ادیب کے ماخذوں میں ایک خط بھی ہے جو انھوں نے اپنے ایک مخلص دوست اور ذی علم ادیب کو خاص تاثرات کے ماتحت دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔ مکتوب الیہ کے خلوص کی بنا پر کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس لیے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں ایک جگہ ارباب زمانہ کی ناقدری کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "میں اس بے التفاتی اور تغافل شعاری کا عادی ہو چکا ہوں۔ لیکن اتنا بے حس اب بھی نہیں ہوا ہوں کہ آپ کے سے مخلص احباب میری جان فشانیوں کو نظر انداز کر دیں اور مجھ پر کچھ اثر نہ ہو۔ مجنوں (قیس عامری) کے بارے میں ایک حکایت یہ بھی سنی جاتی ہے کہ ناواقفوں اور بے دردوں کی سنگ زنی کو وہ برداشت کرتا رہتا تھا لیکن ایک دفعہ ایک دوست نے ایک کنکری ماردی تو وہ فریاد کرنے لگا۔"

اس خط کا آخری حصہ حسب ذیل ہے:-

"شکوہ طرازی میری عادت نہیں، خود ستائی اور خود نمائی میرا شیوہ نہیں۔ آپ نے حضرت علی کے خطبۂ شقشقیہ کا نام سنا ہوگا۔ میرے اس خط کو مکتوب شقشقیہ سمجھ لیجئے۔ مجھے اس خط میں بار بار اپنے مخلص اور محترم دوست جناب ... صاحب کا نام لینا پڑا ہے۔ بغیر اس کے اپنے مافی الضمیر کا واضح اظہار ممکن نہ تھا۔ لیکن خدانخواستہ موصوف کے کثیر المقدار، گوناگوں قابل قدر ادبی خدمات کا استخفاف میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہے۔ صرف آپ کی جانب داری اور ناانصافی کی دوستانہ شکایت مقصود ہے۔"

ان الفاظ سے اُن تاثرات کا سُراغ مل جاتا ہے جن کے ماتحت یہ خط لکھا گیا تھا۔ ہم اس کے بعض اقتباسات حسب ضرورت پیش کریں گے اور "مکتوب ادیب" کے نام

سے اس کا حوالہ دیں گے۔

حالاتِ ادیب کا ایک معتبر ماخذ وہ تقریر ہے جو انھوں نے ۴ ستمبر ۱۹۶۰ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی۔ اس کا موضوع ہے "میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات اور شخصیات"۔ یہ تقریر "آپ بیتی" کے سلسلے میں نقل کی جا رہی ہے۔ ادیب کا ایک خط اور ہے جس سے ان کی خود فراموشانہ ادبی مصروفیتوں کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ اس خط کا ایک طویل اقتباس آئندہ صفحات میں مناسب محل پر پیش کیا جائے گا۔

ماہنامہ "آجکل"، دہلی، اردو تحقیق نمبر مورخہ اگست ۱۹۶۷ء میں علی جواد زیدی نے اپنے مضمون "اردو تحقیق کے چند سنگ میل اور ستون" میں اور اسی رسالے کے اردو نمبر مورخہ اگست ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون "اردو تحقیق آزادی کے بعد" میں مسعود صاحب کے ادبی اور تحقیقی کاموں اور مصروفیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم ان معتبر ادیبوں کے اقوال پیش کریں گے اور ماخذ کا حوالہ مختصراً "تحقیق نمبر" اور "اردو نمبر" کے لفظوں میں دیں گے۔

ادیب نے اپنے خارجی حالاتِ زندگی نہایت اختصار کے ساتھ خود بیان کر دیے ہیں۔ لیکن داخلی زندگی یعنی اپنے عادات و اخلاق، خصائل و شمائل اپنی زبان سے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ چیزیں معتبر راویوں کے بیانات سے اخذ کر کے اس کتاب کے پہلے حصے میں پیش کی جا رہی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں جناب ادیب کی ادبی خدمات کا تعارف کیا گیا ہے اور آپ کے معاصرین کی رائیں پیش کی گئی ہیں۔ ادیب کی ادبی خدمات کا صحیح اندازہ تو ان کی ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی تحریروں کے مطالعے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پیش نظر کتاب سے بھی کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی زیادہ تر مسعود صاحب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور ان کا تخلص یا قلمی نام ادیب ہے۔ راقم نے بھی موصوف کا ذکر بہ نظرِ اختصار انھیں ناموں سے کیا ہے۔

آپ بیتی

ادیب کے حالات کا سب سے معتبر ماخذ وہ آپ بیتی ہے جو انھوں نے اپنی سب سے مقبول کتاب ہماری شاعری کے آخر میں درج کی ہو۔ پہلے اُنی کے اقتباسات مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے جاتے ہیں۔

ادیب کے اجداد | میرا نسبی تعلق سادات کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ جس کے مورثِ اعلیٰ ایران کے مشہور شہر نیشاپور سے آکر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے۔ میرے اجداد ذی عزت اور خوش حال تھے۔ شاہی زمانے کے کچھ سرکاری کاغذ میرے پاس ہیں جن میں میرے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبد المطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہو، جو مضافات لکھنؤ میں واقع تھی۔ یہی کاغذ بتاتے ہیں کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہ ہائے چوکی خاص" میں سے تھے اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے۔ اور والد سید عبد المطلب "منصب دار چوکی خاص" تھے اور پانصدی ذات کا منصب، پچاس روپے نقدی اور ایک لاکھ چھپن[۲۶] ہزار دام کی جاگیر پرگنہ ملیح آباد وغیرہ میں ان کی تنخواہ قدیم سے مقرر تھی۔ وہ عظیم آباد کے سفر میں ابتدا سے بادشاہ کے ہمراہِ رکاب تھے اور ان کو دو روپے یومیہ چھٹا شاگرد پیشے سے ملتا تھا۔ ان کا انتقال شاید اسی سفر کے اثنا میں جھوسی کے مقام پر سنہ جلوس محمد شاہ میں ۲ ذی الحجہ کو ہوا۔ سید عزیز علی نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کر کے یہ درخواست کی کہ موضع چندولی بزرگ عملہ پرگنہ موہان سرکار لکھنؤ جس کی جمع تشخیصی پانچ سو روپے ہے، انعام آل تمغا میں میرے اور سید عبد المطلب کے دوسرے متعلقین کے نام مرحمت فرمائی جائے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس درخواست پر کیا

حکم صادر ہوا، لیکن کئی اور کاغذوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ موضع چند ولی بزرگ میں سید عبدالمطلب پچاس بیگھے کے اور سید عزیز علی ستر بیگھے کے ایمہ دار تھے۔ سید عزیز علی کے ماموں، رفعت پناہ عبداللہ بیگ ولد مراد بیگ بھی منصب دار چوکی خاص و جاگیر دار موضع چند ولی بزرگ تھے ایک کاغذ پر ان کی مہر ہو، جس میں یہ الفاظ درج ہیں "عبداللہ بیگ فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۳۵ھ" خود سید عزیز علی بھی نواب صفدر جنگ صوبہ دار اودھ کے عہد میں منصب دار چوکی خاص تھے۔ ان کا ابتدائی منصب دو صدی ذات تھا، مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ترقی کر کے کس منصب تک پہنچے تھے۔ سید عزیز علی کی ایک جاگیر نواح گورکھپور میں بھی تھی۔ ان کی دولت مندی اور شاہ خرچی کے قصے بیان کرنے والے دو چار بزرگ ابھی چند سال پہلے تک زندہ تھے۔

ادیب کے والد اور ولادت

میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اس میں تموّل تو نہ تھا، مگر پریشاں حالی بھی نہ تھی۔ میرے والد حکیم سید مرتضیٰ حسین صاحب مرحوم ایک ذی علم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اودھ کے ضلع اناؤ میں نیوتنی کا قصبہ ان کا وطن تھا۔ مگر علم کا شوق لکھنؤ کھینچ لے گیا تھا اور آب و دانے کی کشش نے بہرائچ[1] پہنچا دیا تھا۔ جہاں ان کی ذہانت، حذاقت، اتقا، استغنا اور پابندی وضع کو یاد کر کے افسوس کرنے والے بھی بہت تھے، مگر اب شاید کوئی نہ ہو۔ وہیں ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ (۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء) کو میں پیدا ہوا۔

اضافہ مؤلف کے قلم سے

راقم حروف نے وہ اجازہ یعنی سرٹیفکٹ دیکھا ہے جو ان کے استاد لکھنؤ کے نامور طبیب اور بے مثل معالج حکیم شیخ علی محمد نے ان کو عربی زبان میں دیا تھا۔ وہ عمدہ کاغذ پر طلائی لوح اور رنگین جدولوں کے درمیان میں بہت پاکیزہ خط میں لکھا ہوا مسعود صاحب کے پاس موجود ہے۔ حمد و نعت کے بعد تحریر فرمایا ہے۔

[1] والد نے محلہ ناظر پورہ میں ایک مکان لے کر اس کو حسب منشا درست کرنے کی غرض سے کچھ سامان عمارت خرید لیا تھا۔ لیکن بہرائچ کا قیام ترک کرتے وقت وہ مکان مع اسباب و دواخانہ وقف عام کر دیا۔

"وبعد فان الفطن الحبيب اللبيب الاريب الاديب الطبيب السابق المبرز المحرز لقصبات السبق على الاقران والاماثل المعقود عليه الانامل المحلى بكل زين المنجلى عن كل شين الحكيم المولوی السيّد مرتضٰی حسینؑ حرسه الله عن النوائب وحماه عن الخطأ فى رايه الصائب قد قرأ علیّ شطرا وافيا من الكتب الطبية الطبية ليالى واياما وجلس فى المطب وزاد فى المشق لهذ المطلب شوقا وغراما كمن صرف فى تحصيله وبحث عن اجماله وتفصيله احوالا واعواما ومكث عندنا زمانا طويلا وسعى فى تكميله سعيا جميلا وخاض فى معالجة الاسقام وارتاض فى معالجة الداء العقام وداوى المرضى بما هو احب وارضى حتى كملت فى الطب بصيرته وحسنت فى العلاج عسيرته وجبلت على الخير سريرته فهو حقيق بان يرجع اليه الناس ويعتمد على رأيه حين الباس فاجزته هداه الله احسن منهاج ان يشتغل بالعلاج ويبذل جهده فى اصلاح المزاج و اشترط عليه الاحتياط والتجنب عن التفريط والافراط فانه سوى الصراط وعمدة ما اومى اليه واوصى به بقراط واخر دعوىٰنا ان الحمد لله رب العالمين والصلوٰة على محمّد وعترته سادات العالمين"

لا اله الا الله الحكيم عبده علی محمد ابن عبد العلام حکیم محمود علی

کلکتے میں بڑے بڑے حاذق طبیب سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ لیکن ان کی آخری بیماری میں علاج کے لیے لکھنؤ سے دو طبیب بلوائے گئے یعنی حکیم شیخ علی محمد اور حکیم عبد العلی۔

"سنہ ۱۳۰۳ھ کے آخر میں بادشاہ سخت علیل ہو گئے۔ باوجود علاج و معالجہ مرض بدستور رہا۔ حسب تجویز منصرم الدولہ وغیرہ حکیم محمد عبد العلی صاحب لکھنؤ سے طلب کیے گئے۔ اس کے بعد جناب حکیم شیخ علی محمد صاحب بھی لکھنؤ سے بلائے گئے۔ بادشاہ عالی جاہ نے حکیم شیخ علی محمد صاحب سے ارشاد کیا کہ آپ داخلی علاج کریں اور آپ (حکیم محمد عبد العلی صاحب کی طرف اشارہ کر کے) خارجی علاج کریں۔"

(تجلیاتِ حصہ اول صہ ۱۹۵)

ابتدائی تعلیم جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہوا یعنی میری عمر کے پانچویں سال پانچویں مہینے پانچویں دن میری بسم اللہ ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم ہونے لگی۔ میرے والد مجھ کو اپنے نقش قدم پر چلانا اور طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مگر میں ابھی صرف دس برس پانچ مہینے کا تھا کہ انکی ناوقت وفات نے میری تعلیم کا رُخ بدل دیا۔

والدہ کی ہمت افزائی والد کے انتقال کے بعد چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عزیزوں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ میرے تعلیمی مصارف کا بار اٹھاتا۔ مالی اعانت کا کیا ذکر خالی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا۔ تحصیل علم کے شوق کی آگ جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی وہ اس افسردگی کے عالم میں ضرور بجھ کر رہ جاتی اگر میری والدہ مرحومہ کی مردانہ ہمت اسے بھڑکاتی نہ رہتی۔

اسکول کی کامیاب زندگی مختصر یہ کہ شوق کی رہنمائی اور استقلال کی دست گیری

میں تعلیم کی منزلیں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ طے ہونے لگیں۔ اسکول کا کوئی امتحان ایسا نہ تھا جس میں میں نے اول درجہ حاصل نہ کیا ہو، اور کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس میں ہر امتحان میں میں نے سب سے زیادہ نمبر نہ پائے ہوں۔ میرے تمام استاد اس رائے پر متفق تھے کہ رسائی ذہن اور سلامت فہم میں سارے اسکول میں ان کا کوئی جواب نہیں، اور محاسن اخلاق میں یہ قابل تقلید نمونہ ہیں۔

تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں میں تعلیم کے راستے میں ترقی کے قدم تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا تھا اور ورناکیولر فائنل امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول کے آٹھویں درجے تک پہنچا تھا کہ مشیت ایزدی نے میرے قوائے ذہنی کی ڈاک گاڑی میں درد سر کا "بریک" لگا دیا۔ اس وقت سے سات آٹھ سال تک شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو کہ میں شدید یا خفیف درد سر میں مبتلا نہ ہوں۔ اس پرانے رفیق نے مدت دراز تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک اشارے میں آموجود ہوتا تھا اور کبھی کبھی دن بلکہ بعض اوقات کئی کئی ہفتے سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اب کئی سال سے سر میں ایک دوسری تکلیف پیدا ہوگئی ہے، جس نے دماغی کاموں کو اور زیادہ مشکل کر دیا ہے۔

کالج کی تعلیم اور ترکِ تعلیم دردِ سر کی تکلیف ہی کیا کم تھی کہ کچھ دن بعد تبخیر کی شدت نے اس کے ساتھ شریک ہو کر میری زندگی تلخ کر دی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ جان ہے تو جہان ہے مگر جہالت کی زندگی پر میرا دل کسی طرح راضی نہ ہوا اور جو قدم آگے بڑھ چکے تھے وہ پیچھے نہ ہٹ سکے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں میں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کا امتحان پاس کر لیا۔ کالج کے درجوں میں میں نے جو مضمون پڑھے وہ یہ ہیں۔ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی، فارسی، تاریخ، منطق، تشریح الاعضاء، اور بی، اے میں انگریزی، فلسفہ اور فارسی۔

بی، اے پاس کر کے میں نے ایم، اے کے درجے میں نام لکھوایا اور ایک سال

انگریزی ادبیات کی تحصیل میں صرف کیا، مگر امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ سبب یہ تھا کہ دوران سال میں مجھ پر ہیضے کے مہلک مرض کا حملہ ہوا۔ بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی مگر زندگی باقی تھی بچ گیا۔ ضعیف و نحیف تو ہمیشہ سے تھا ہی اب عاشقانہ ضعف و نقاہت کی شاعرانہ تصویر ہو کر رہ گیا۔ اب نہ اتنا دم تھا کہ محنت کر کے امتیازی کامیابی حاصل کر سکوں، نہ یہ گوارا تھا کہ تیسرے درجے میں پاس ہو کر چلتے چلاتے اپنی طالب علمانہ نیک نامی کو داغ لگاؤں۔

پہلی ملازمت اور کثرت مطالعہ

اسی اثنا میں صوبۂ متحدہ کے سررشتہ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی، جس کا کام یہ تھا کہ ہر سہ ماہی میں اس صوبہ میں جتنی کتابیں چھپیں، ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے صوبے کے سرکاری اخبار (یو، پی گورنمنٹ گزٹ) میں شایع کی جائے۔ اور جمہور کے خیالات کا رجحان دریافت کرنے کی غرض سے کتابوں پر تبصرے لکھ لکھ کر اس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کیا جائے جو سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔ اپریل ۱۹۱۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ اور دس برس کے مسلسل قیام کے بعد مجھے بادل ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد میں رہنا پڑا۔ کوئی ساڑھے تین سال میں نے اس جگہ پر کام کیا۔ اس زمانے میں صوبہ متحدہ میں ہر سال ڈھائی ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔ اس طرح اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں میری نظر سے گزریں۔ مطالعے کی اس کثرت اور تنوع نے میری نظر میں وسعت اور دل میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں سجھائیں۔

ال، ٹی کی سند اور ہائی اسکول کی چند روزہ ملازمت

مدت مذکورہ تک اس جگہ پر کام کرنے کے بعد میں نے ساڑھے نو مہینے کی رخصت لے کر ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد میں فن تعلیم کی تحصیل کر کے ۱۹۱۲ء میں ال، ٹی کی سند حاصل کر لی۔

اسی سال جولائی کے مہینے میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں میرا تقرر ہوگیا۔ اس وقت صوبہ متحدہ کے سرکاری اسکولوں میں، کوئی مسلمان ٹیچر تنخواہ کے اعتبار سے مجھ سے سینیر نہ تھا۔ اس لیے ہیڈ ماسٹری آنکھوں کے سامنے تھی جس کا گریڈ اس وقت ۲۵۰-۲۵-۸۰۰ تھا اور اس کے بعد بھی سررشتہ تعلیم ہی میں ترقی کے دوسرے راستے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن اپنی زبان کا عشق اور اس کی خدمت کا شوق اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ لکھنؤ کا قیام اور اردو کا کام میری سب سے بڑی تمنا تھی۔

اردو کی محبت میں ایثار اور یونیورسٹی کی ملازمت اس ملازمت کے صرف چالیس دن بعد جب لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیر لکچرر کی جگہ مجھ کو دی گئی تو میں نے تمام مالی منفعتوں اور منصبی ترقیوں کے امکانات کو نظر انداز کر دیا اور سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر یونیورسٹی کی ملازمت بہ خوشی قبول کر لی۔

کمیاب کتابوں کی تلاش ادبیات کا ذوق اور اپنی زبان کی خدمت کا شوق تو پہلے ہی سے تھا، اب ادبی تحقیق فرائض منصبی میں داخل ہوگئی اور میں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں لگ گیا۔ چار پانچ سال مسلسل اسی تلاش میں لکھنؤ کی تمام گلیوں کی خاک چھانی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ محنت رائگاں نہیں ہوئی اور ادبی تحقیق کے لیے بہت سا گراں قدر سامان فراہم ہوگیا جس میں اب بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اردو کے لیے پھر ایثار سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں کوئی ڈیڑھ برس فارسی کے سینیر لکچرر کی قائم مقامی کی اور اسی زمانے میں فارسی ایم، اے کا امتحان اول درجے میں اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ لیکن جب فارسی کے لکچرر کی جگہ پر میری مستقلی کا مسئلہ پیش ہوا تو خود درخواست دے کر میں اپنی پہلی جگہ پر واپس آگیا۔ جونیر لکچرر کا گریڈ ۲۰۰-۲۵-۲۵۰ اور سینیر لکچرر کا گریڈ ۲۵۰-۲۵-۵۰۰ تھا۔ لیکن مقصد زندگی تو اردو کی خدمت تھا، اس لیے ایک دفعہ پھر مستقل مالی نقصان

برداشت کرلیا مگر اردو سے قطع تعلق گوارا نہ کیا۔

حسنِ خدمت کا اعتراف | یونیورسٹی کی ملازمت کو ابھی صرف چار سال ہوئے تھے کہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے حسنِ خدمت کے صلے میں مجھ کو تنخواہ کے علاوہ پچیس روپیہ ماہوار بھتہ (پرسنل الاؤنس) ملنے لگا۔

شعبہ اردو میں ترقیاں | اگست ۱۹۲۷ء میں اردو کے سینیر لیکچرر کی ایک نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہوگیا۔ اس کے تین سال بعد فارسی کے ریڈر اور شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہوگئی۔ جس کا گریڈ ۵۰۰-۵۰-۸۰۰ تھا اور اگست ۱۹۳۰ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ اس گریڈ کی انتہائی تنخواہ پر پہنچنے کے بعد میری تنخواہ میں ۱۴۰ روپیہ ماہوار پرسنل الاؤنس کا اضافہ ہوگیا۔ اس طرح ان مالی نقصانات کی کسی حد تک تلافی ہوگئی، جو میں نے اردو کی خدمت کے شوق میں عمداً برداشت کیے تھے۔

سیاسی ہنگامے مزید ترقی میں حائل | ۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی کی مجلسِ عاملہ (Executive council) نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مجھ کو فارسی اور اردو کے پروفیسر کا درجہ دیا جائے۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد سیاسی ہنگاموں کا وہ زور ہوا جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوگیا اور فرقہ وارانہ تعصبات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ملک کی زبانیں اور ادبی ذوق بھی تقسیم ہوکر اردو اور فارسی زبانیں پاکستان کے حصے میں چلی گئیں۔

پروفیسری اور ملازمت سے سبکدوشی | جب ہنگامے فرو ہوئے اور تعصبات کی شدت کچھ کم ہوئی تو مسلسل آٹھ سال میری حق تلفی کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء کی منظور کی ہوئی تجویز پر عمل کیا گیا اور میں ۱۹۵۳ء میں ۱۰۰۰-۵۰-۱۲۵۰ کے گریڈ میں ہزار روپے ماہوار پر فارسی اور اردو کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۵ جون ۱۹۵۴ء کو میری عمر سرکاری حساب سے ساٹھ سال کی ہوگئی جو یونیورسٹی کی قواعد کی رو سے

ملازمت کی آخری حد تھی اور میں اسی تاریخ کو بتیس ۳۲ برس لکھنؤ یونیورسٹی کی خدمت اور ۲۴ برس اس کے شعبۂ فارسی و اردو کی صدارت کر کے ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔

ایران و عراق کا سفر مدت سے اس سرزمین کی زیارت کا اشتیاق تھا جو صدیوں تک تمام عالم اسلامی کے لیے تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکی ہے اور جس کا اثر آج تک ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جب فارسی ادب اور اُس کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ فرائض منصبی میں داخل ہو گیا تو اس دیرینہ اشتیاق نے ایک ضرورت کی شکل اختیار کر لی اور میں جون ۱۹۳۳ء میں ایران کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے راستے سے اُس ارضِ حُسن و شعر میں داخل ہوا اور زاہدان، برجند، تربتِ حیدری، مشہد مقدس، طوس، نیشاپور، سبزوار، سمنان، دامغان، طہران، شاہ عبد العظیم، قم، اصفہان، تخت جمشید وغیرہ کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا۔ ابھی سیاحت ایران کا نصف پروگرام بھی پورا نہ ہوا تھا، مگر مسلسل سفر کی تکلیفوں سے تنگ کر میں نے بوشہر کا رخ کیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر بصرے پہنچا اور عراقِ عرب کے مشہور شہروں کی سیر اور وہاں کے عتباتِ عالیات کی زیارت کر کے بحری راستے سے ہندوستان واپس آ گیا۔

محدود دائرہ عمل اور ادبی خدمات تندرستی کی بے التفاتیاں اور دہر کی عنایتیں جون ۱۹۱۰ء سے میرے شاملِ حال رہیں۔ انھوں نے میری قوتِ عمل کو مضمحل اور جوشِ عمل کو افسردہ کر دیا۔ مجھ کو دنیا کے شور و شر سے الگ رہ کر سکوت اور سکون کی زندگی بسر کرنا پڑی اور اپنے دائرہ عمل کو ادبیات کے حلقے میں محدود کر دینا پڑا۔ بہر حال ذوق کی تحریک، حالات کی مساعدت اور خیالات کی یکسوئی کی بدولت مجھ سے جو تھوڑا بہت کام اب تک ہو سکا ہے اس سے میرا شمار ادب کے خدمت گزاروں میں ہونے لگا ہے اور میرے خود فراموشانہ انہماک سے امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی ادب کی کچھ قابلِ ذکر خدمت انجام دے سکوں گا۔ اب تک جن کتابوں

کی تصنیف، تالیف، ترتیب، ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔ امتحانِ وفا، فرہنگِ امثال، ہماری شاعری، فیضِ میر، مجالسِ رنگین، دبستانِ اردو، روحِ انیس، نظامِ اردو، جواہرِ سخن جلد دوم، شاہکارِ انیس، اردو زبان اور اس کا رسمِ خط، فائز دہلوی اور دیوانِ فائز، متفرقاتِ غالب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، رزم نامۂ انیس، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، تذکرۂ نادر، فسانۂ عبرت، آئینۂ سخن فہمی، گلشنِ سخن، اندر سبھا کا مقدس ڈراما۔

کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر ان کی تکمیل ہو گئی تو امید ہے کہ اردو ادب میری خدمتوں کو جلد فراموش نہ کر سکے گا۔

ذوقِ سخن شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے، مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خود رو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تاثرات کا پرتو ہیں۔ اس لیے وہ اچھے ہوں یا برے بہرحال سچی شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔

مطمئن اور سبق آموز زندگی اپنی زندگی کی نہایت مختصر روداد پیش کر چکا۔ خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ کا افسوس نہیں، آیندہ کی فکر نہیں۔ جو ہوا اچھا ہوا، جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

میرے حالاتِ زندگی کی تفصیل میں بے مددگار طالب علموں اور ہونہار نوجوانوں کی ہمت افزائی کا کافی سامان موجود ہے مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً صرف اتنا کہتا ہوں کہ میری تعلیمی زندگی بالکل اور کاروباری زندگی بہت کچھ عالی ہمت عرفی کے اس شعر کی

مصداق ہے۔

یوسف وشِ آنکہ راست بُود بہرِ فتحِ باب　　محتاجِ التفاتِ کلیدش نمی کنند

میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات و شخصیات

میرے لڑکپن کا پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ جو آگے چل کر میری ادبی زندگی پر اثر انداز ہوا، میرے والد کی ناوقت وفات تھی۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آجاتا تو میں اردو کا ادیب نہیں عربی کا عالم ہوتا۔ اس واقعے نے میری تعلیم کا رخ بدل دیا۔ عربی کی تحصیل جاری نہ رہ سکی اور میرا نام ایک پرائمری اسکول کے آخری یعنی چوتھے درجے میں لکھوا دیا گیا۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اردو کی پانچویں کتاب نصاب میں داخل تھی۔ ان کا اسلوبِ تحریر اتنا پسند آیا کہ ایک ایک سبق کئی کئی دفعہ پڑھا اور ان کے نصابی سلسلے کی اور کتابیں بھی اسی شوق کے ساتھ پڑھ ڈالیں۔ اس میں شک نہیں کہ میرے ادبی ذوق کی بنیاد انھیں کتابوں سے پڑی۔ آگے چل کر جب اردو کے ممتاز ادیبوں کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا تو مولانا محمد حسین آزاد کے کمالِ انشاپردازی کا سکّہ دل پر بیٹھ گیا اور میں کچھ دن ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کرتا رہا۔

اسکول میں مولانا سید جواد صاحب اور کالج میں مولانا علی اصغر صاحب، یہ دو شخصیتیں ایسی ملیں جو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ دونوں اسلامی علوم کے عالم، عربی کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ دونوں اردو کے شاعروں میں میر انیس کے عاشق اور مرزا غالب سے بیزار تھے۔ سید جواد صاحب غالب کی فارسی دانی کے قائل تھے۔ مگر غالب کی شاعری پر مضحکہ کرتے تھے۔ غالب کا یہ شعر بڑے مضحک انداز میں پڑھتے تھے۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا　　وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور آتش کے اس شعر پر جھوم جاتے تھے۔

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے روانہ کشتی عمر رواں ہے

آتش کا یہ مطلع بھی ان کو بہت پسند تھا۔

سُرمہ لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی موت آئی پھر کسی نہ کسی بے گناہ کی

اور جب اسی غزل کا یہ شعر پڑھتے تھے

مجھ ناتواں کی خاک جو اس میں ہوئی شریک اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئی گرد راہ کی

تو ان پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے غالب کی وہ غزل ان کو سنائی جس کا مطلع ہے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

کسی شعر کی تعریف نہ کی، مگر جب میں نے مقطع پڑھا۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

تو بے ساختہ کہہ اٹھے "ایسا کیوں نہیں کہتا۔ یہ کم بخت کیوں کہتا ہے۔"

مولانا علی اصغر صاحب، غالب بیزاری میں سید جواد صاحب سے بھی بہت آگے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کسی ایک شاعر کو ہر حیثیت سے تمام دوسرے شاعروں سے بہتر قرار دینا مشکل ہے۔ اجازت ہو تو چند شاعروں کا نام لوں۔ فرمایا اچھا۔ میں نے کہا میر، انیس، غالب، غالب کا نام سنتے ہی تند و تلخ لہجے میں بول اٹھے "یہ میر اور انیس کے ساتھ غالب کا کیا جوڑ؟ اس کو نہ اردو پر عبور نہ فارسی پر، ہزل کی جگہ جد ہے، جد کی جگہ ہزل ہے، ایک بے امتیاز شخص تھا۔" ان دونوں فاضل اور شفیق استادوں کی صحبت سے کافی فیض پایا، لیکن غالب کے بارے میں ان کا ہم خیال کبھی نہ ہو سکا۔

میری ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پہلی سرکاری ملازمت ہے۔ جس میں

کام یہ تھا کہ اس صوبے میں جتنی کتابیں کسی موضوع پر کسی زبان میں چھپیں اُن کی مضمون وار وضاحتی فہرست تیار کرکے ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری گزٹ میں شائع کی جائے اور عوام کے خیالات کا رجحان معلوم کرنے کی غرض سے ان پر تبصرے لکھے جائیں۔ اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی کوئی دس ہزار کتابیں نظر سے گزریں۔ اس طرح میری نظر میں وسعت اور دل میں تالیف و تصنیف کا شوق پیدا ہوا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں دکھائی دیں۔ میری ادبی زندگی کی ابتدا یہیں سے ہوئی اور یہیں میں نے لارڈ ٹینیسن کے بے نظیر منظوم افسانے اِنیک آرڈن کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ امتحانِ وفا کے نام سے شائع کیا۔

سررشتۂ تعلیم کا یہ شعبہ جس میں مَیں کام کرتا تھا، اس کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت شمبھو ناتھ شکل ایک بڑے ذی علم اور بلند خیال بزرگ تھے۔ ہندوستان کی بیشتر زبانوں سے واقف تھے، فارسی اور سنسکرت میں اچھی دستگاہ تھی، انگریزی لکھنے اور بولنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انگریزی کے اچھے شاعر تھے اردو اور ہندی میں بھی شعر کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خاندانی سرپرست کے انتقال پر ایک بڑا اور دناک مرثیہ ہندی میں کہا تھا۔ جس کا آخری شعر مجھ کو اب تک یاد ہے۔

پر بھو در بیٹھے سورگ میں دور پرے سکلیس
کوئی جائے سنائیہے اپنو سوگ سندیس

پنڈت جی اپنی غیر معمولی قابلیت کے علاوہ ایک ایسی شاندار، بے باک اور بے مثل شخصیت کے مالک تھے جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ تین چار برس چھ سات گھنٹے روزانہ ان کا ساتھ رہا اور میں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔

اب میں اپنی ادبی زندگی کے چند واقعات ایسے بیان کرتا ہوں جو گویا ایک زنجیر

کی کڑیاں ہیں اور جن کو بھول جانا ممکن نہیں۔ میں نے ڈاکٹر اشپرنگر کی مرتب کی ہوئی شاہانِ
اودھ کے کتب خانوں کی فہرست میں، میر کی خود نوشتہ سوانح عمری ذکرِ میر کا ذکر پڑھا۔
مجھ کو میر سے جو دلی عقیدت ہے اس کی بنا پر اس کتاب کے لیے دل بے چین ہو گیا۔
مگر کسی تذکرے یا تاریخ ادب میں اس کا ذکر نہ تھا، نہ کسی کتب خانے میں اس کی موجودگی
کا علم تھا۔ اس لیے یہ امید نہ تھی کہ اس کتاب کی زیارت کبھی نصیب ہوگی۔ ایک دن
ایک شخص پرانی کتابیں بیچنے کے لیے لایا۔ میں نے اُن پر ایک نظر ڈالی۔ ان میں ایک
قلمی نسخہ تھا جس پر ذکرِ میر، لکھا ہوا معلوم ہوا۔ جلدی جلدی باقی کتابوں کو الٹا پلٹا اور
سب کتابوں کی مجموعی قیمت ادا کر کے کتب فروش کو رخصت کر دیا۔ اب اس قلمی نسخے
کو غور سے دیکھا تو اس میں شک نہ رہا کہ یہ وہی ذکرِ میر ہے جس کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی
تھیں۔ کتاب کے ورق الٹنا شروع کیے۔ ذکرِ میر ختم ہو گئی تو میر کا رسالہ فیضِ میر نظر آیا۔
اس کی ورق گردانی ختم ہوئی تو میر کا فارسی دیوان دکھائی دیا۔ میر کی تین تین نایاب
تصنیفیں گھر بیٹھے ایک ساتھ مل گئیں۔ مجھ کو زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی
اس دن ہوئی۔

میں نے ذکرِ میر کو شایع کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس کو مرتب کرنے اور اس پر مقدمہ
وغیرہ لکھنے کی تیاری میں بڑے شوق کے ساتھ مصروف تھا کہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی
رسالے اردو میں مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مقالہ اسی کتاب پر شایع ہوا اور اس
کے ساتھ یہ اعلان بھی کہ انجمن ذکرِ میر کو بہت جلد شایع کرنے والی ہے۔ اس خبر سے میرے
دلی شوق کا شعلہ بجھ کر رہ گیا اور جتنی خوشی یہ کتاب پا کر ہوئی تھی اتنی ہی مایوسی یہ خبر سن
کر ہوئی۔

ذکرِ میر کی ترتیب سے دست بردار ہونا پڑا تو میں فیضِ میر کی ترتیب میں مصروف
ہو گیا۔ اسی اثنا میں رسالہ 'نیرنگ' رام پور کا میر نمبر نکلا جس سے معلوم ہوا کہ فیضِ میر کا

ایک نسخہ رام پور میں بھی ہے۔ میں رام پور پہنچا کہ اپنے نسخے کا اس نسخے سے مقابلہ کر کے بعض مشکوک الفاظ کی تصحیح کر لوں۔ وہاں نیرنگ کے ایڈیٹر فیض اللہ خاں مرحوم سے معلوم ہوا کہ وہ رسالہ ایک ایسے شخص کے پاس ہے، جنھوں نے اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی ان کو سخت تاکید کر دی ہے۔ غرض کہ وہ کتاب دیکھنے کو نہ ملی اور میں بے نیل مرام واپس آیا۔ اب واقعے کو کبھی بھول نہیں سکتا۔

ایسے ہی ناقابل فراموش واقعات میری ادبی زندگی میں بہت سے پیش آئے۔ مگر ان سب کو بیان کرنے کا وقت کہاں۔

جن اشخاص کا ذکر ابھی میری زبان پر آگیا ان کے علاوہ جن شخصیتوں کو میں کبھی بھول نہیں سکتا ان کے نام یہ ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا، مرزا محمد عسکری، مولانا صفی لکھنوی، حضرت آرزو لکھنوی، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت منوہر لال زتشی، پنڈت کشن پرشاد کول، یہ سب ادب نواز و ادب آفریں ہستیاں دنیا سے رخصت ہو گئیں، مگر ان کی یاد میرے دل میں باقی رہ گئی۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

وطن انیس احمد عباسی کاکوروی ادیب کے وطن کے بارے میں لکھتے ہیں "ضلع اناؤ میں نیوتنی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جسٹس سر امیر علی، مولوی نظام الدین حسن مرحوم، جسٹس سید محمد رضا مرحوم، نواب ناظر یار جنگ سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد، اردو کے مشہور شاعر سید آل رضا صاحب رضا، یہ سب نیوتنی ہی کی مردم خیز سرزمین کی پیداوار ہیں.... ہمارے ممدوح سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کا وطن بھی نیوتنی ہی ہے۔ اس لیے موصوف کی ذات بھی اس قصبے کے لیے باعث فخر ہے۔

ابتدائی تعلیم ادیب نے آپ بیتی میں اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "اگلے زمانے میں بڑے

سے بڑے درجے کے ذی علم لوگ کچھ طالب علموں کو درس دیتے تھے ..... میرے لڑکپن تک بعض معزز و محترم ذی علم اور صاحب ثروت بزرگ اس طریقے پر عامل تھے اور میں نے ایسے دو بزرگوں کی تعلیم سے فیض پایا ہے۔ اناؤ میں چودھری سید محمد ماہ صاحب تعلقدار اناؤ سے جامع عباسی کے بعض حصے پڑھے اور نیوتنی ضلع اناؤ میں مولوی محمد حسن صاحب صدر اعلیٰ سے عربی کی ایک ابتدائی کتاب پڑھی۔" (لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۴۵)

"چودھری سید محمد ماہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ تعلقدار اناؤ ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بزرگ تھے۔ مرحوم کے چہرے پر زہد و اتقا کا وہ نور تھا کہ ہر شخص ان کے احترام پر مجبور اور ان کی معصومیت سے مسحور ہو جاتا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ کم عمری میں میں نے ایسے بزرگ کی تعلیم سے فیض حاصل کیا اور کچھ دن فقہ امامیہ کی مشہور و مقبول کتاب 'جامع عباسی' کا درس لینے کے لیے جناب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ استادی اور شاگردی کے اس چند روزہ سلسلے کی بنا پر مرحوم کی بزرگانہ شفقت کی نعمت ہمیشہ حاصل رہی۔"

گلستان سید از چودھری سید احمد عباس زیدی
تخلص بہ سعید تعارف از مسعود حسن رضوی ادیب
سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء۔

اب مسعود صاحب کی ابتدائی تعلیم کا کچھ حال اُن کی زبان سے سُن کر لکھا جاتا ہے" بہرائچ میں مجھ کو فارسی پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب رکھے گئے۔ انھوں نے رواج زمانہ کے مطابق آمد نامہ شروع کرا دیا۔ ایک دن میرے والد مرحوم نے میرا سبق سُنا جس میں مصدر خائیدن سے اسم فاعل ترکیبی کی مثال میں لفظ 'سنگ خائے' سامنے آگیا۔ والد نے معنی پوچھے میں نے بتایا 'کنکریاں چبانے والا' انھوں نے پوچھا یہ معنی کس نے بتائے ہیں۔ میں نے کہا ہمارے مولوی صاحب نے۔ والد

مرحوم مولوی صاحب کی جہالت پر بہت جز بز ہوئے اور ان کو موقوف کر دیا۔

میری عمر دس برس کی تھی کہ والد نے انتقال کیا۔ ان کے انتقال کی روداد قابل ذکر ہے۔ ان کی طبیعت کچھ زمانے سے بہت خراب رہتی تھی۔ ایک دن صبح کو جب حسبِ معمول انار انگور وغیرہ سامنے رکھے گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ میرے حصے کا رزق ختم ہو گیا ہے۔ رات کو میرے آقا و مولا امیر المومنین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ کل تیری مشکل آسان ہے، میں حضرت کے ارشاد کو خوب سمجھتا ہوں۔ کچھ کچھ دیر کے بعد کہتے تھے معلوم نہیں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ میرے آقا کا قول غلط تو ہو نہیں سکتا۔ مجھ کو بلوا کر کچھ نصیحتیں اور وصیتیں کر کے رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود اپنا پلنگ پکڑوا کر قبلہ رخ کیا، قرآن مجید منگوا کر سورۂ یٰسین پڑھ کر لیٹ گئے اور روح پرواز کر گئی۔ چہرے پر موت کے آثار مطلق نہ تھے، نزع کی کوئی کیفیت نہ تھی۔ دیر تک امتیاز نہ کیا جا سکا کہ موت ہے یا سکتہ۔ ایک نامی حکیم صاحب نے کچھ تدبیریں کرنے کے بعد موت کا یقین کیا۔

والد کے انتقال کے وقت میرا قیام اپنے وطن قصبہ نیوتنی میں تھا۔ ان کی وفات کے بعد نیوتنی کا قیام ترک کر کے میں اناؤ میں اپنی نانی صاحبہ کے ساتھ رہنے لگا اور ڈیڑھ دو برس تک ان کے بڑے بھائی مولوی عبد العلی صاحب سے پڑھتا رہا۔ انھوں نے مجھ کو مرثیہ پڑھنا بھی سکھایا۔ مرثیہ خوانی کی مشق کے لیے میر انیس کے ایک مرثیے کے چند بند منتخب کر دیے تھے۔ اس مرثیے کا پہلا بند یہ ہے ؎

جوہر کشائے تیغ دو پیکر حسینؑ ہے ۔۔۔ زور کنندۂ درِ خیبر حسین ہے

جرار و سرفروش و دلاور حسین ہے ۔۔۔ کھولا درِ نجات وہ صفدر حسین ہے

معمور شہر کفر کا دروازہ کر دیا

اسلام کے چمن کو تر و تازہ کر دیا

نانی صاحبہ کی محبت آمیز سخت گیر تربیت سے مجھ کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کے والد میر سلامت علی مرثیہ خوانی میں میر انیس کے نامی شاگرد تھے۔ زبان کی صحت کا خیال مرحومہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ میری ہر غلطی پر سختی سے ٹوکتی تھیں۔ اناؤ کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے بعض مقامی الفاظ میری زبان سے نکل جاتے تھے تو ان کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے گیند اچھالنا کی جگہ گیند الارنا کہہ دیا تو انھوں نے میری بڑی خبر لی۔ فرمایا تم تو بالکل گنوار ہو گئے ہو، تم کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ ایک مرتبہ چھپ رہنا کی جگہ لک رہنا کہہ دیا تو اسی سختی کے ساتھ تنبیہہ کی۔ ان کی گفتگو میں بڑی ادبیت ہوتی تھی۔ ایک محترم خاتون لکھنؤ سے مہمان آئیں۔ انھوں نے مزاج پوچھا جواب میں فرمایا بیٹی کیا پوچھتی ہو۔ زندگی طول کھینچتی جاتی ہے، عمر کا جام لبریز ہی نہیں ہوتا۔

"اناؤ میں صرف ایک ہائی اسکول تھا جس میں داخلے کے لیے انگریزی کی واقفیت لازمی تھی۔ اس لیے اناؤ سے تین میل کے فاصلے پر کرون نام کے ایک گاؤں میں اپر پرائمری اسکول کے چوتھے درجے میں نام لکھوا دیا گیا۔ اس کم سنی کے عالم میں روزانہ تین میل پیدل جانا اور شام کو تین میل واپس آنا خاصا صبر آزما کام تھا جو تحصیل علم کے شوق میں گوارا کر لیا گیا۔ سات مہینے کے بعد میں چوتھے درجے کے امتحان میں پاس ہو گیا۔ اب اناؤ میں ورناکیولر فائنل اسکول قائم ہو چکا تھا۔ وہاں سے پانچواں اور چھٹا درجہ پاس کر کے میں حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں داخل ہو گیا۔"

ادیب کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے عہد طفولیت ہی سے بیحد دشوار گزار وادیوں سے گزرنا پڑا۔ کم سنی ہی میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ نہ کوئی سرپرست تھا نہ کوئی صحیح مشورہ دینے والا۔ لیکن وہ مبدا فیاض کی عطا کردہ اعلا صلاحیتیں اور ہوشمند قابلیت لے کر اس دنیا میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنی بلند پایہ فطری ذہانت اور غیر معمولی سلامت روی کو اپنا راہبر اور مشیر بنا کر ہر دکھ درد کو فاتحانہ انداز میں

جھیل ڈالا اور اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ طلب علم میں دلچسپی شغف کی بدولت ان کے استادوں نے ان کو ذہانت ذکاوت کے اعتبار سے منفرد اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لحاظ سے دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ قرار دیا۔ اس ابتدا کی انتہا یہی ہونا چاہیئے تھی کہ مسعود صاحب نہ صرف علم و فضل میں بلکہ بعض دوسرے انسانی خصائل اور اخلاقی فضائل میں آج ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ (آپ بیتی ختم ہوئی)

حلیہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: "متوسط قد، بلند پیشانی، گیہواں رنگ جو کبھی کھلتا ہوا ہوگا، چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک۔"

مرزا محمد عسکری: "داڑھی منڈاتے ہیں، سر کے بال بوضع اہل ایران پیچھے سے اٹھے اور بل کھائے ہوئے"

علی عباس حسینی: اس زمانے (۱۹۱۵ء) کا حلیہ مرزا محمد عسکری اور ڈاکٹر ہاشمی کے بیان کردہ حلیے سے قدرے مختلف تھا۔ رنگ نسبتاً زیادہ صاف تھا۔ میری ہی طرح دبلے پتلے تھے۔ اور خشخشی فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مگر اُن کی بلند اور روشن پیشانی ان کے درخشاں مستقبل کی طرف اس وقت بھی اشارہ کرتی تھی۔

بالائے سرش ز ہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی"

علی جواد زیدی: "بال اب سفید ہو چلے ہیں۔ ڈاڑھی کے کچھی گنہ گار نہیں ہوئے، مونچھیں بھی آدھی ہی رکھیں،۔۔۔ بال خوش سلیقہ ہیں، پیچھے کی طرف ذرا بڑے مگر پٹے سے بہت کم، قد بلند، جسم صحت مند، ہونٹ پتلی مگر بے حد متین مسکراہٹ پر ہمہ وقت آمادہ۔"

راقم حروف نے ۱۹۱۵ء میں جب پہلے پہل دیکھا ہے اس وقت عنفوان شباب میں بھی خشخشی فرنچ کٹ نما ڈاڑھی موجود تھی اور مدت دراز تک موجود رہی۔ ایران و عراق

کے سفر سے واپس آنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں رخصت ہوگئی۔ مونچھیں ہمیشہ برقرار رہیں، لیکن ان کی وضع بدلتی رہی۔ داڑھی کے ذکر پر کبھی کبھی کہتے تھے کہ میری داڑھی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب سے رخساروں پر رونگٹے ہوئے ہیں اُس وقت سے اِن میں استرہ کبھی نہیں لگا۔

حافظہ ادیب کا حافظہ بہت قوی ہے۔ انھیں ہزاروں اشعار، اقوال، امثال، روایات، حکایات اور واقعات یاد ہیں۔ حسینی صاحب کا بیان ہے کہ "مسعود صاحب کا حافظہ بلا کا ہے۔ جس چیز کو دھیان دے کر دو یا تین بار پڑھ لیتے ہیں، وہ حرف بہ حرف یاد ہو جاتی ہے۔ شعرا تو بہت سے ایسے دکھائی دیتے ہیں جنھیں اپنے کلام کے سینکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحب طرز نثر نگار میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سناتا چلا جائے۔"

"مسعود صاحب کے اس حافظے نے جہاں ان کو اپنا علم تازہ رکھنے کا گراں بہا موقع دیا اور انھیں ایک فاضل اور ایک ادیب بے عدیل کی خود اعتمادی بخشی، وہیں انھیں مشاعروں کی شرکت سے معذور بنا دیا۔ جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور انھیں اساتذۂ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آ گیا۔ تو پھر اگر صاحب شعر کی تعریف کرتے ہیں، تو سرقے کو صریحاً سراہتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو سکوت سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لیے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی۔"

ادیب کے حافظے کے متعلق ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنا تجربہ یوں بیان کیا ہے:۔

"ادیب صاحب کی افتاد مزاج کچھ ایسی ہے کہ روزمرہ کی باتوں میں بھی ان کے یہاں شمّہ برابر افراط و تفریط یا بے احتیاطی نہیں ہوتی۔ آج سے تیس پینتیس سال پہلے جو بات انھوں نے بیان کی تھی، اگر آج بھی وہ اسے دہراتے ہیں تو بلا کم و کاست وہی لفظ، وہی بات بلکہ جملوں اور لفظوں کے ادا کرنے کا لہجہ بھی وہی ہوتا ہے جو اُس

وقت تھا۔ یہ ان کے تحقیقی مزاج، سلامتی طبع اور حافظے کی ایسی خصوصیت ہے جو شاذ و نادر ہی کہیں مل سکے گی۔"

اردو اور فارسی اشعار کے علاوہ ہندی کی بعض نظمیں اور راماین کے بعض مقامات بھی انھیں برزبان ہیں۔ لیکن اب کچھ عرصے سے اپنے حافظے کی شکایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ پرانی باتیں تو بہت سی حافظے میں محفوظ ہیں، لیکن نئی باتیں اگر یاد بھی ہو جاتی ہیں تو بہت جلد دھیان سے اتر جاتی ہیں۔ جب کوئی ان کے حافظے پر تعجب کا اظہار کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اب میرے حافظے پر نہیں میرے نسیان پر تعجب کیجیے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

طرز گفتگو: انیس احمد عباسی کا بیان:

"سید مسعود حسن صاحب صرف لکھنے ہی میں ادیب نہیں ہیں، بلکہ ان کی بات چیت اور انداز گفتگو میں بھی ایک خاص ادبیت پائی جاتی ہے اور جب تقریر کرتے ہیں تو وہ بھی ادبیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

ایک علمی اور ادبی شخص میں سنجیدگی تو بہرحال ہونا ہی چاہیے، مگر مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان کی باتوں میں ایک خاص ادبی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اگر آپ میں خود بھی کچھ علمی و ادبی مذاق ہے۔ ... تو آپ کو خود ہی ان کی باتوں اور ان کے انداز گفتگو سے یہ محسوس ہو جائے گا کہ آپ کا مخاطب کوئی بلند پایہ ادیب ہے۔"

نور الحسن ہاشمی کا بیان:

"گفتگو تحریر و تقریر میں آپ ادیب پہلے ہیں اور کچھ بعد کو۔ باتیں سنیے تو ایسی مزیدار اور پر معلومات کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجیے اور آپ کا

جی نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف، شستہ اور ڈھلی ہوئی گویا منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منھ سے ہر لفظ بجا تلا نکلتا ہے.... ان کے منھ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال باہر آپ نہ سنیں گے۔ تقریر نہایت مدلّل، مستحکم اور مفصل کرتے ہیں، ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ حتی الوسع تشنہ نہیں رہتا۔ یہ تقریریں اردو میں ہوں یا انگریزی میں، ہندی میں ہوں یا فارسی میں، نہایت روانی، فصاحت اور شستہ زبان میں گل افشانیاں ہوتی ہیں ۔"

علی جواد زیدی کا بیان:-

" ان کے ملاقاتیوں میں ان سے علمی اور مالی اعتبار سے بہت کمتر لوگ بھی ہیں، لیکن کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سے بڑے سے بات کر رہا ہے۔ بات کرتے وقت مسعود صاحب یا تو مخاطب کو اپنی سطح پر لے آتے ہیں یا خود مخاطب کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح مغایرت کی دیواریں گر جاتی ہیں اور یگانگت و مساوات کی ہلکی سی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے ۔"

" لطائف و ظرائف کا سلسلہ شروع ہوگا تو اس میں اپنی جانب سے بھی کچھ سنجیدہ اضافے کریں گے۔ ادبی بحث ہوگی تو آپ اپنی پوری بات پورے زور شور سے کہیں گے۔ صحبتوں کو اپنی علمیت اور ادبیت سے روشن کر دیں گے۔"

"آواز میں فطری جھنکار، بول چال میں شگفتگی اور شیرینی.... باتوں میں جوش و خروش نہیں ہوتا بلکہ قلقل مینا کا سا ترنم ہوتا ہے.... آداب محفل، اخلاقی اقدار اور حفظ مراتب کے بہت قائل ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جن سے چالیس چالیس برس کی دوستی ہے ان سے بھی سوا آپ کے تم کر کے گفتگو نہیں

ہوتی "

ڈاکٹر اعجاز حسین کا بیان :

"مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطہ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں، لیکن ان کے طرز استدلال سے اثر نہ لینا آسان نہیں "

(مختصر تاریخ ادب اردو) گیارھواں ایڈیشن ۱۹۹۵ء

شوکت تھانوی اپنے ظریفانہ انداز میں مسعود صاحب کی شیریں گفتاری کا ذکر یوں کرتے ہیں :-

"مسعود صاحب اردو کے شیدائیوں میں سے ہیں ۔ ان کی خدمات سے قطع نظر صرف ان کو اردو بولتا ہوا سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزہ لے کر مٹھائی کھا رہا ہو ۔ وہ ایک ایک لفظ سے ایسا مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہوگا کہ سننے والے کے منہ میں پانی بھر آوے گا "

گزشتہ ستاون برس میں مسعود صاحب سے لاکھوں بار ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ۔ شروع اور بھرپور جوانی کے ایام میں طبیعتاً میں بیحد متلون رہا ہوں کہیں اور کسی کے پاس کبھی بلا مطلب رسمی ملاقات میں زیادہ دیر ٹھہرنا دل کو گوارا نہیں ہوتا تھا لیکن مسعود صاحب کی تنہا وہ ذات تھی جہاں گھنٹوں پاس بیٹھنے کے بعد بھی کبھی دل نہیں گھبرایا ۔ اول تو ان کی خوش گفتاری دوسرے پُر از معلومات تقریریں ۔ ان کے پاس بیٹھ کر معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا تھا ۔ خوش گفتاری کا یہ عالم رہتا ہے کہ ان کی غصہ سے بھری گفتار بھی سبق آموز ہوتی ہے ۔ اول تو ان کو غصہ بہت کم آتا ہے اور جب آیا بھی تو فوراً اتر گیا پھر بھی اس اقل قلیل وقفہ میں شائستگی اور انسانی ہمدردی کا عنصر کبھی زائل نہیں ہوا ۔

ڈاکٹر محمد حسن کا بیان:-

"میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اردو داں نہیں دیکھا جو گفتگو میں بھی اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط تلفظ، یا [کوئی فقرہ] غلط کوئی ترتیب کے ساتھ نہ نکلے۔"

(ماہنامہ آجکل، دہلی، اپریل ۱۹۷۱ء ص)

شعر و شاعری۔ ادیب کے ایک طویل مضمون کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس سے ان کے ذوق شعر کی ابتدا کا سراغ ملتا ہے۔ یہ مضمون آج جولائی ۱۹۲۹ء میں ماہنامہ نیرنگ رام پور میں 'نوحۂ بسمل پر ایک نظر' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

"میں نے بچپن میں یہ مشہور نقل سنی تھی کہ کسی شاعر نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم سے کی۔ جہیز میں اس بات کا خیال رکھا کہ ضروریات زندگی میں سے تا امکان کوئی چیز نہ جائے۔ مگر جب دلہن کی فینس دولھا کے دروازے پر پہنچی اور سسرال والیاں آغوش شوق پھیلائے، چشم اشتیاق کھولے ہوئے دلھن اتارنے کو گئیں تو جس پیکر شباب کو آغوش حجاب میں دیکھنے کی تمنا تھی اسے خواب اجل سے ہم کنار پایا۔ درد آشنا دل سمجھ سکتے ہیں کہ موت کی اس ستم ظریفی سے دیکھنے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بدنصیب باپ کو جب اپنے سرمایۂ حیات کے لٹ جانے کی خبر ہوئی تو غم کے طوفان اور آنسوؤں کے سیلاب میں یہ شعر بے ساختہ زبان سے نکل گیا۔

اب آیا یاد اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

کچھ شبہ نہیں کہ اس شعر نے اصل واقعے سے بھی زیادہ دلوں پر اثر کیا ہوگا۔ جو آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئی ہوں گی، اب ان سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی ہوگی

ہو گی۔ میں نے جب یہ نقل اپنی والدۂ مرحومہ سے سُنی ہے اس وقت میری عمر چھ سات برس سے زیادہ نہ تھی۔ یعنی وہ سِن تھا جب دل غم کے احساس سے ناآشنا اور درد کی خلش سے بیگانہ ہوتا ہے۔ مگر اللہ رے اثر کہ میرے ذوق شعر کی ابتدا یہیں سے ہوئی اور یہ پہلا شعر تھا جو میرے دل میں چبھا اور جا نِطے میں یوں بیٹھ گیا کہ آج تک اس واقعے کی یاد اور اس شعر کا اثر دل سے نہیں مٹا۔"

علی جواد زیدی:۔ "آپ اب سے بہت پہلے شاعر بھی تھے۔ باقاعدہ شاعر ہونے کے لیے جس ظاہری بے پروائی اور بے نظمی کی ضرورت ہے وہ مسعود صاحب میں کہاں تھی۔ اس لیے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔"

مسٹر جی، ایم شاہ کا سوال:۔ "آپ کے نام نامی کی طرح آپ کا تخلص ادیب بھی مشہور و معروف ہے۔ اس سے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ جناب کو شعر گوئی سے بھی شوق ہے۔

جواب۔ شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے۔ لیکن شاعر بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ جب سے ادبی تحقیق میں انہماک رہنے لگا اُس وقت سے شاعری سے دلچسپی کم ہوتی گئی۔ مشہور سائنسداں ڈارون نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ابتدا میں مجھ کو شاعری اور موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ شکسپیر کے ڈرامے مجھے بے حد پسند تھے۔ لیکن جب سے سائنسی تحقیق میں منہمک رہا شعر کا ذوق کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ شکسپیر کا ایک ڈراما پڑھنے کی کوشش کی تو میرا جی متلانے لگا۔ مجھ کو شاعری سے متلی تو اب بھی نہیں ہوتی مگر شعر سے دلچسپی میں کمی ضرور ہو گئی ہے۔

جناب ادیب "آپ بیتی" میں اپنی سخن گوئی کے متعلق رقمطراز ہیں:۔ "کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور مترنم شکل میں بے ساختہ ادا ہو گئے۔ ان خودرو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے۔ میرے شعر میرے قلبی تاثرات کا پرتو ہیں اس لیے وہ اچھے ہوں یا بُرے، بہرحال سچی شاعری کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ چند

شعر اس آپ بیتی کے آخر میں پیش کیے جائیں گے۔"

وہ چند شعر حسبِ ذیل ہیں:-

جذبِ دل کا بے نیازی سے اثر بڑھتا گیا
میں ہٹا جس جس طرف عالم اُدھر بڑھتا گیا

کچھ عجب حالت ہے راہِ منزلِ مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

فرطِ خود بینی سے دنیا بن گئی آئینہ زار
ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں

کیا کہوں دیوانگیٔ عشق کی رسوائیاں
زلف کے پابند بھی باندھے گئے زنجیر میں

اک فنا زارِ تمنّا، اک بہارستانِ شوق
کیا بتائیں ہم نے کیا دیکھا تری تصویر میں

ہے اک نقشہ دلِ مجبور کی اٹھتی امنگوں کا
لبِ ساحل حبابوں کا ابھرنا اور مٹ جانا

دردِ دل ہنس ہنس کے کہنے دے ذرا اے مشقِ ضبط
اک دلِ درد آشنا کا امتحاں لینا ہے آج

آپ کی چشمِ کرم نازِ مسیحائی ہے
ابھی کچھ مردہ تمنّاؤں میں جان آئی ہے

پاؤں میں ہوتی ہے بیڑی کی گرانی محسوس
دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آزاد ہوں میں

جلا جن سے نشیمن جب وہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں
تو چار آنسو بہا آتا ہوں میں خاکِ نشیمن پر

یہ سعیِ پردہ داری ہو اور رائیگاں ہو
وہ حالِ دل جو پوچھیں ہر بُنِ مُو زباں ہو

سمجھے تھے طوفانِ ہستی میں جسے جائے پناہ
ایک موج کوہ پیکر وہ بھی تھی ساحل نہ تھا

اب خبر دیکھیے بیمار کی کیا آتی ہے
ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے

اس کی چشمِ مست سے ہشیاریوں کے در کھلے
دل کی دنیا کے بہت سے راز اب ہم پر کھلے

ان دنوں کیوں جی نہیں لگتا ہو گلشن میں کہیں
برق کو شاید ہے پھر میرے نشیمن کی تلاش

خوفِ رسوائی نہیں تو ضبطِ غم سے کام کیا
پختہ کارانِ جنوں کو ہوشِ ننگ و نام کیا
خط سے کیا مطلب مجھے قاصد سے مجھکو کام کیا
دل میں جو رہتا ہے اس کو نامہ و پیغام کیا

مجھے قاسمِ ازل سے کبھی کچھ گلا نہ ہوتا
جو یہ غم ملے تھے مجھ کو تو یہ دل ملا نہ ہوتا

وہ سیرِ دشت وحشت اور وہ میرے دل کی ویرانی
ادھر تھا میں بیاباں میں ادھر مجھ میں بیاباں تھا

گریۂ غم پہ بھی آ گے جسے آتی تھی ہنسی
وہی دل خندۂ شادی سے بھی دلگیر ہوا اب
تھے ہم آزاد جب آباد تھی دنیائے خیال
حلقۂ حدِّ نظر حلقۂ زنجیر ہے اب
صفحۂ دل کے سوا جو کہیں دنیا میں نہ تھی
ذرّے ذرّے میں جہاں کے وہی تصویر ہے اب
اب کہاں وہ میں کہ جس کے لب کا ہوا انخلائے غم
دل میں طاقت چاہیئے ضبطِ فغاں کے واسطے

بس اک یہی حسرت ہے اب اے طولِ جدائی
مجھ سے جو ملیں وہ تو میں جی کھول کے رو لوں

ہم سخن لاکھوں ہیں لیکن ہم زباں کوئی نہیں　　مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوت خانہ ہے

خوشی میں رنج بھی کیا مآل کے غم کو　　خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو

اپنی تدبیروں پہ اے غافل نظر تو نے نہ کی　　ورنہ پڑھ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا

غمِ شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سہنا پڑا　　اپنے ہم دردوں سے آخر دردِ دل کہنا پڑا

ہر تبسم میں وہاں پنہاں تھی برقِ عقل سوز　　میں سمجھتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے

ہم خاک کو سمجھا کیے اکسیر ابھی تک　　تدبیر رہی تابعِ تقدیر ابھی تک
پھر ظلم پہ مائل ہیں تو اتنا بھی سمجھ لیں　　باقی ہے مری آہ میں تاثیر ابھی تک

شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھوا ئے ہو　　حال کس بسمل کا اس نازک سے دیکھا جائے ہو

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیب　　تیور بدل گئے مرے نازک مزاج کے

پیری آئینے سے خود مجھ کو یہ دیتی ہے صدا　　اب میں جانوں کہ ترے ناز اٹھائے کوئی

دنیا کو کیا خبر مرے حالِ تباہ کی　　فرصت کہاں ہجومِ مصائب میں آہ کی

دیکھئے قسمت کی محرومی کہ مثلِ سنگِ راہ　　جس کے قدموں سے لگا میں اس نے ٹھکرایا مجھے

طاقتِ پرواز بھی ہے ہمّتِ پرواز بھی　　کاش پر ہوتے نکلتی حسرتِ پرواز بھی

سخن فہمی: غالبؔ کا قول ہے ۔

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یعنی شعر سے متاثر اور لطف اندوز ہونے کے لیے دلِ گداختہ کی شرط ہے ۔ مسعود صاحب کو قدرت نے یہ نعمت بڑی فراوانی سے عطا کی ہے ۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں " دل میں گداز ایسا ہے کہ غیرت و حمیّت ، شرافت و محبّت ، وفا و اخلاص کے ذکر پر آب دیدہ ہو جاتے ہیں ۔ بس ضبط و تحمّل مزاج کا جز بن گئے ہیں "

راقم کا مشاہدہ ہے کہ کوئی شعر یا کوئی بات جس سے نرم اور لطیف جذبات کو ٹھیس لگتی ہو اس کو ادا کرتے وقت ان کا چہرہ متغیّر ہو جاتا ہے ، لہجہ بدل جاتا ہے اور پورا شعر پڑھنا یا پوری بات کہنا دشوار ہو جاتا ہے اور ضبط و تحمّل کی کوشش کے باوجود میر انیس کا یہ مصرع صادق آجاتا ہے

' کب رکتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے '

میں بھی فخر سے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر
جن پہ قربان زباں اور قلم کے جوہر

نسیم قریشی: " پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ساری عمر مشرقی شعر و ادب کے بہت سنجیدہ مطالعے میں گزری ہے ۔ انھوں نے بڑے ریاض و محنت سے اردو شاعری کے حسنِ باطن تک رسائی حاصل کی ہے اور گہری ہمدردی کے جوش میں ڈوب کر اسے بے نقاب

کیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'ہماری شاعری' ان کی اعلیٰ شعر فہمی' نکتہ آفریں ذہن اور گہرے ادبی انداز فکر پر پوری طرح دلالت کرتی ہے۔"

(اردو ادب کی تاریخ۔ کمال پرنٹنگ پریس' دہلی ۱۹۵۵ء)

علی عباس حسینی 'ہماری شاعری' پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود صاحب کی سخن فہمی کی یوں داد دیتے ہیں "مصنّف نے جہاں اشعار کا مطلب لکھا ہے اور تمثیلی اشعار کو واقعات عالم پر منطبق کیا ہے وہاں سخن فہمی کا اعجاز دکھایا ہے۔"

(رسالہ نیرنگ خیال' لاہور' اپریل و مئی ۱۹۲۸ء)

'مختصر آپ بیتی' میں ادیب کہتے ہیں "شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے۔ مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔"

شعر خوانی۔ علی عباس حسینی: "ان کی آواز بڑی شیریں ہے۔ خود بھی شعر بڑے لحن سے پڑھتے تھے اور اس زمانے کے تمام خوش الحان شعرا کا کلام انھیں کے انداز اور لب و لہجے میں سنانے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔"

مسعود صاحب شعر خوانی کا اصلی کمال یہ ہے کہ کسی شعر کے سمجھنے میں جو دقّت ہوتی ہے وہ اُن کے صرف پڑھ دینے سے حل ہو جاتی ہے اور شعر کا مطلب آئینہ ہو جاتا ہے۔ ان کی شعر خوانی حقیقت میں ان کے غیر معمولی ملکۂ سخن فہمی کا ایک پرتو ہے۔

لکھنؤ کے خلق مجسم اور صد درجہ ہر دلعزیز بیرسٹر حامد علی خاں مرحوم نے ولایت میں انگریزی زبان کے ایک کامل پروفیسر مسٹر ہارٹلی سے شعر پڑھنا سیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے "پڑھنے میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ شعر کی سراپا تصویر بن جائے۔ لیکن یہ بات بہت ہی کم پڑھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ... دوسرے درجے پر آواز سے شعر کا ادا کرنا یعنی جو حالت شعر میں بیان کی گئی ہے اس کو کما حقہٗ ادا کرنا چاہیے۔ محبت رنج، غم، خوشی، شجاعت، تعجب، فکر، غصّہ جو حالت شعر میں ہو وہ پوری ادا کی

جائے اور اس طرح کہ تصنّع بالکل معلوم نہ ہو۔"

(یادگار حامد مرتبہ لسان القوم مولانا صفی لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ)

شعر پڑھنے کا وہ سب سے بڑا کمال یعنی شعر کی سراپا تصویر بن جانا تو مسعود صاحب کو حاصل نہیں ہے، لیکن مذکورہ بالا دوسرے درجے کے کمال میں ان کو اول درجہ حاصل ہے اور ان کا یہ کمال کسی کی تعلیم کا ثمرہ نہیں بلکہ قدرت کا عطیہ ہے۔

نثر نگاری۔ علی جواد زیدی: "مسعود صاحب اردو نثر کے صاحبان اسالیب میں سے ہیں۔ ان کا طرز تحریر قدما میں محمد حسین آزاد اور حالی سے بیک وقت متاثر ہے۔ نہ تو جدید نثر اردو کی طرح جملوں کی ساخت تک میں مغربی تصنیفوں کی نقالی ہے اور نہ عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات کے باعث مصنوعی گرانباری۔ ان کا سنبھلا ہوا انداز بیان صاف اور شستہ اردو کا اچھا نمونہ ہے۔ استدلال میں متانت کے علاوہ وضاحت اور منطقی زور ہے...... ان سب پر مستزاد ادبی چاشنی ہے، جو خشک بحث کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ یہ طرز نگارش آپ کے مزاج اور طبیعت کی پوری آئینہ داری کرتا ہے۔"

عابد رضا صاحب بیدار نے اپنی کتاب نثر کا حسن میں نثر کو بنیادی نثر اور طرحدار نثر دو خانوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے زیدی صاحب لکھتے ہیں "بنیادی نثر اساسی نثر ہے جو حشو و زوائد، صناعی اور مصنوعی اثر آفرینی سے گریز کر کے صنّاعانہ سادگی سے بات کو قاری تک پہنچاتی ہے۔ اس نثر کا لکھنا طرحدار نثر لکھنے سے کم مشکل نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، سید عابد حسین اور مسعود حسن رضوی ادیب کی نثر کی وقعت اس لیے کم نہیں ہے کہ وہ سادہ اور عاری ہے۔ یہ لوگ جس طرح مشکل مباحث اور معانی کو بھی پانی کر دیتے ہیں اور اس سادگی کے باوجود اثر انگیزی میں کمی نہیں آنے دیتے وہ ایک ہنر ہے۔"

(آج کل، دہلی، مارچ ۱۹۷۰ء ص ۳۵-۳۶)

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، تلفظ، لہجہ، تذکیر و تانیث، محاورات، اصطلاحات اور امثال وغیرہ کی جتنی واقفیت مسعود صاحب کو ہے اتنی شاید ہی کسی اور کو ہو۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین: "صحیح اور سادہ نثر لکھنا مسعود صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے جو باوجود اپنی سادگی کے نہ تو بے کیف ہوتی ہے اور نہ خشک، بلکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے ایک خاص روانی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ شروع سے آخر تک آپ کا طرز نگارش یکساں اور ہموار ہے۔ باوجود ثقیل اور وزنی مسائل پر گفتگو کرنے کے پڑھنے والوں کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔"

"کئی ایک کارآمد کتابیں آپ مرتب بھی کر چکے ہیں ..... ان میں آپ نے مقدمات بھی لکھے ہیں جن کو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل مضمون کی اہمیت حاصل ہے۔ ان مقدمات میں بھی آپ کے الفاظ و زبان نرمی اور روانی کے لحاظ سے دلکشی اور دلچسپی کا سرمایہ ہیں۔"

(مختصر تاریخ ادب اردو۔ گیارھواں ایڈیشن صفحہ ۴۹۸)

معاشرت ۔ مرزا محمد عسکری: "آپ تمدن کے عناصر ثلاثہ یعنی خوراک، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں، کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں اور اپنے تخلص ادیب کے لحاظ سے آپ نے ادب کے دونوں پہلو یعنی لٹریچر اور تہذیب و اخلاق اچھی طرح اختیار کیے ہیں۔ مزاج میں نفاست، سلامت روی، حسن سلوک اور استقامت اور یک رنگی ہر ہر بات سے نمایاں ہے۔"

علی عباس حسینی: "باریک بینی، نفاست پسندی اور سلیقہ مندی ان کی فطرت و طبیعت ہے۔ لباس ہو یا غذا، مکان ہو یا تصنیفات کی کتابت و طباعت ہر چیز میں جزئیات پر نظر رہتی ہے۔ جب تک ایک ایک بات نک سک سے درست نہ ہوگی منظر عام پر نہیں آ سکتی۔ تحقیق کے معاملے میں یہی باریک بینی اکثر دیر کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کام میں تحقیق کی خردبین ساتھ رہتی ہے۔"

علی جواد زیدی: "مسعود صاحب صرف جامہ زیب ہی نہیں ہیں بلکہ کپڑے بھی اچھے پہنتے ہیں اور رہائش کے معاملے میں نفاست پسند ہیں۔ مرحوم مرزا محمد عسکری نے اپنی تصنیف من کلیتم میں لکھا ہے کہ مسعود صاحب کھانا بھی بہت اچھا کھاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود مزاج میں ایک ستھرا پن اور صوفیانہ پن بہت نمایاں ہے۔"

شوکت تھانوی: "ان میں رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کا بڑا سلیقہ ہے۔ ہر بات سے فطری نفاست پسندی جھلکتی ہے۔ اور ان سے ملنے والے کو ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے خطاطی کا کوئی نہایت نفیس نمونہ دیکھا ہو۔"

علی جواد زیدی نے ایک دوسرے موقع پر مسعود صاحب کا تعارف یوں کیا ہے
"ہماری شاعری کے مصنف، روح انیسؔ کے خالق، واجد علی شاہ پر حرف آخر، ہر بات نپی تلی، ہر ادا اینچی رچی، باوضع، خوش مزاج، دوررس، نکتہ شناس۔"

(آپ سے ملیے مطبوعہ کتاب ص۲۵)

نور الحسن ہاشمی: نے مسعود صاحب کے اوصاف یہ بتائے ہیں "خوش وضع، شریف طبیعت، خوش مزاج، متین اور سنجیدہ۔"

انیس احمد عباسی: "مسعود صاحب طبعیتاً بے حد سنجیدہ، بہت نیک اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ آپ مذہبی آدمی نہیں ہیں[1]۔ مگر آپ کا شمار تعلیم یافتہ شیعوں کے اس گروہ سے کیا جاتا ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں ترقی پسند کہا جاسکتا ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن: "پھر سید مسعود حسن رضوی کی شخصیت ہے جن کی شائستگی، نرمی اور ملائمت نے مجھے انسانیت کے نئے تصور سے آشنا کیا۔ ان کے یہاں علم کی وہ انکساری ملتی ہے

---

[1] عباسی صاحب کا یہ قول اس معنی میں درست ہے کہ مسعود صاحب مذہبیت کی نمائش نہیں کرتے ہیں اور مذہبی تعصب سے بری ہیں۔
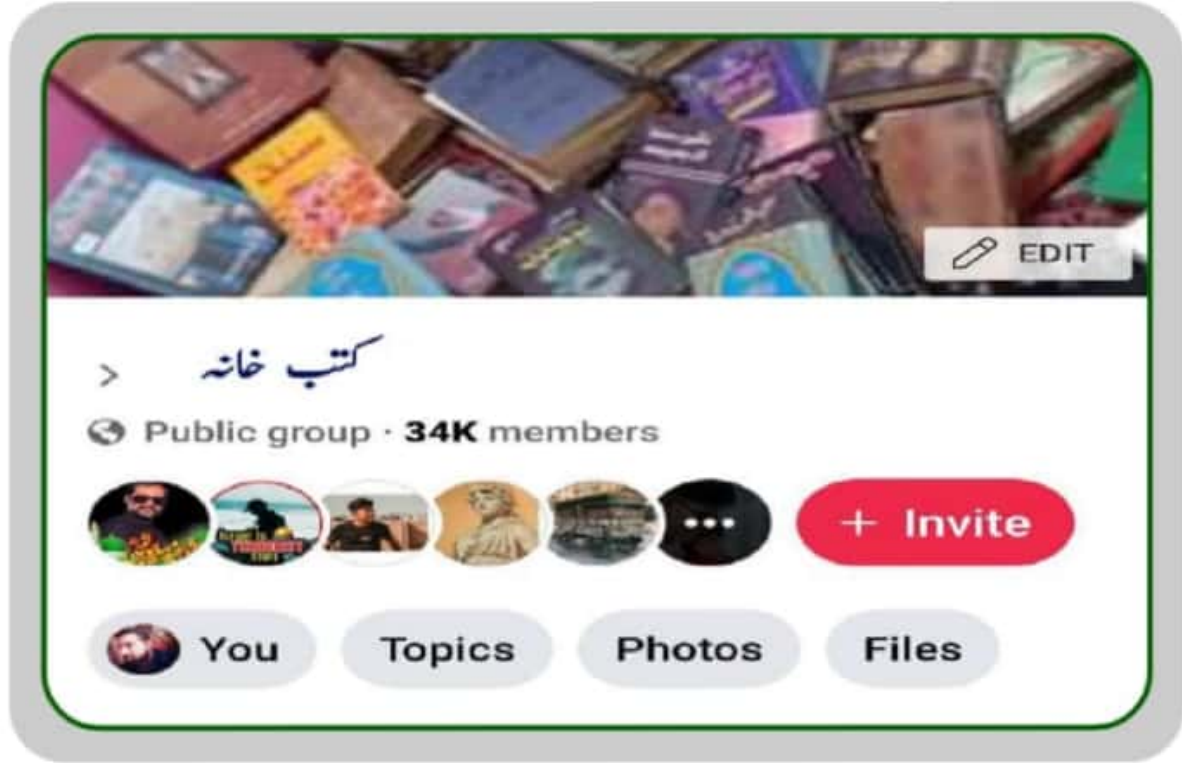
جو صرف سچّے عالم کی پہچان ہے۔"

(ماہنامہ آجکل، دہلی، اپریل ۱۹۷۱ء ص)

معاشرتی حد بندیاں۔ علی عباس حسینی: "مسعود صاحب نے اپنے اور دوسرے کے لیے مختلف حدیں کھینچ رکھی ہیں، بے تکلفی کی حد، دوستی کی حد، عزیزداری کی حد۔ اس لیے کہ ہر چیز میں انضباط ضروری ہے۔"

علی جواد زیدی: "صحبتوں کو اپنی علمیت اور ادبیت سے روشن کر دیں گے، لیکن آپ کو ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہے گا کہ مسعود صاحب اس کے آگے نہیں جا سکتے۔ یہ پرانے اخلاقی اقدار اور معاشرتی معیار کی حدِ آخر ہے، اسے ہم حدِ ادب بھی کہہ سکتے ہیں۔

"گھر والوں سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں ہوتے۔ ان کا ایک نظام الاوقات، ایک طرزِ بود و ماند، ایک طریقِ نوشت و خواند ہے۔ اس میں کسی کی خاطر سے وہ کوئی تبدیلی نہیں کرتے۔ ان کی ناقابلِ تسخیر انفرادیت راہیں روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

علی جواد زیدی: "میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا کہ مسعود صاحب مردم بیزار یا مغرور ہیں۔ وہ بہت یار باش تو نہیں ہیں، لیکن اُن کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے۔"

مختلف طبقے کے لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس مختلف النوع اور رنگارنگ مجمع میں مسعود صاحب کے لیے ہر جگہ ایک مخصوص جگہ ہے۔ آپ کی آمد پر سبھی خوش ہوتے ہیں اور تعظیم کے ساتھ آپ کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ لیکن کسی مجمع میں کبھی نہ تو آپ اس طرح گھل مل جائیں گے کہ اس کا جزو لاینفک بن جائیں اور نہ بیگانہ وار، تماشائی مثال کسی لامعلوم گوشے میں بیٹھے ہی رہیں گے۔ آپ اپنی سنجیدہ انفرادیت کو ہر جگہ باقی رکھیں گے۔ ہر جگہ اہلِ علم کا اور بزرگوں کا آپ خود بھی احترام کریں گے۔ اپنے سے چھوٹوں کی بات بھی خموشی سے سُنیں گے۔

"ان میں غرور بالکل نہیں ہے۔ میں ان کا ایک ادنیٰ طالب علم تھا۔ لیکن میں نے ایک بار رسالہ زمانہ میں ان سے اختلاف رائے بھی کیا ہے اور آج تک وہ مجھ سے اس طرح ملتے ہیں گویا اس طرح کی کوئی بات وجود میں ہی نہیں آئی۔"

خوش مزاجی۔ علی جواد زیدی: "ایسا نہیں کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں تبسموں اور قہقہوں کی یا ہلکے پھلکے لمحوں کی کمی ہے۔ نہیں یہ سب انھیں بے حد مرغوب ہیں۔ اور پھر اچھے، لطیف اشعار کا وہ خزانہ جو کبھی خالی نہیں ہوتا، ان کا سب سے بڑا رفیق ہے۔ اس لیے اگرچہ مسعود صاحب اوامر و نواہی کو سختی سے برتتے ہیں پھر بھی نہ تو وہ زاہد خشک ہیں اور نہ عالم مقطّع۔ جو لوگ سرور و کیف کے طالب ہوں وہ مسعود صاحب کی صحبتوں سے محظوظ ہوں گے۔ لیکن بدمستی تو درکنار وہاں ایسا نشہ بھی نہ ملے گا جس کے بعد خمار کا اندیشہ ہو۔"

فطری شرم۔ علی عباس حسینی: "فطرتاً شرمیلے بلکہ جھینپو تھے۔ مجھ سے خود بیان کرتے تھے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جب لکھنؤ آئے تو برسہا برس یہ حالت رہی کہ جہاں دو چار لڑکوں کو ایک جگہ کھڑا دیکھتے تھے تو رستہ کترا کر نکل جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سچا بہادر وہ ہے جو ڈرنے کے باوجود ہمت و جرأت کا کام کرے۔ اس نظریے کے ماتحت مسعود صاحب یقینی جری ہیں، اس لیے کہ انھوں نے لکھنؤ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم کی تکمیل کی..... معلم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے درجوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے اور بڑے بڑے مجمعوں میں عالمانہ، ادیبانہ اور مدلل تقریریں بھی کیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اُس فطری شرم کا اثر ان میں اب بھی باقی ہے۔ ہر جگہ گھس پیٹھ کے اپنا کام نکال لینا اب بھی اُن سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے نجی کاموں کو انجام دینے کے لیے زیادہ تر دوسروں سے مدد لینا پڑتی ہے۔

سادگی۔ ادیب، کے لباس میں، گفتگو میں، نقل و حرکت میں، غرضکہ کسی بات میں بناوٹ اور ظاہرداری سے کوئی لگاؤ نہیں۔ بتدریجی ترقیوں کے ساتھ مزاج کی فطری سادگی میں کوئی

فرق نہیں آنے پایا بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔"
علی جواد زیدی:

"مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مسعود صاحب اسی زمرے کے انسانوں میں ہیں۔ ان کی ظاہری سادگی اور فطری نیکی کو دیکھ کر اس بلندیِ مقام اور عمقِ نظر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو سودائے تحقیق نے ان کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ ... مسعود صاحب کی سادگی ... ایک حُسنِ ذاتی ہے جو تکلف سے بَری ہے۔ گلاب کے دامن کی طرح مخملی اور حریری ہوتے ہوئے بھی گل بوٹے سے مبّرا۔"
سنجیدگی۔ علی جواد زیدی: "غالباً مسعود صاحب کی سنجیدگی عالم رویا میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتی ہو گی۔ اقبال کو یہ خواہش ہونے لگی تھی کہ پاسبانِ عقل کبھی کبھی دل کو تنہا بھی چھوڑ دے۔ لیکن مسعود صاحب ایک لمحے کے لیے بھی پاسبانِ متانت کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ ان کے لیے لازمۂ حیات ہے۔

"پہلی ملاقات کو اب چوبیس برس گزر چکے ہیں... اس طویل مدت میں آپ کو میں نے بہت زیادہ اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن آپ کو اس طرح کبھی نہ دیکھ سکا جو دیکھنے کا حق ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کے گرد علم و ادب و تحقیق کے علاوہ متانت و سنجیدگی کا ایک ایسا حلقہ بن گیا ہے جس کے اندر کوئی داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ہی نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ کسی نے بھی آپ کو بہت قریب سے نہیں دیکھا ہے۔ آپ جہاں بھی رہتے ہیں آپ کا رکھ رکھاؤ بآوازِ بلند یہ اعلان کرتا رہتا ہے کہ 'بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است۔"

ادیب کو اوائل عمر ہی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور اپنی راہوں کا تعین خود کرنا پڑا۔ کوئی ایسا بزرگ موجود نہ تھا جو ان کو مناسب اور مخلصانہ مشورہ دے سکے۔ اس

صورت میں ان کے لیے سوا اس کے چارۂ کار نہ تھا کہ خود اپنی ذات کو اپنا رہنما بنائیں اور اپنے مزاج اور کردار کے مطابق عمل کریں۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے ذاتی جوہر کھل کر سامنے آئے اور ان کی شخصیت کے بہت سے ایسے پہلو روشن ہو گئے جو سازگار حالات اور بزرگوں کی ہدایتوں کے سائے میں غالباً اتنے روشن نہ ہو پاتے۔

ان پہلوؤں میں عالی ہمتی، حمیت، استغنا اور خودداری سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

خودداری۔ علی عباس حسینی نے مسعود صاحب کی خودداری کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان کے رہن سہن سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ انھیں کوئی مالی دشواری بھی پیش آسکتی ہے۔ طالب علمی میں بھی جب سوا وظیفوں کے کوئی سہارا نہ تھا ان کا لباس صاف ستھرا رہتا تھا اور ان کے چہرے مہرے سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ بعض وقت ان کے پاس فیس کے روپے بھی نہیں ہوتے۔" حسینی صاحب نے اس سلسلے میں ان کے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ "ایف۔ اے کا امتحان سر پر تھا امتحان اور کالج کی فیس ملا کر پچاس روپے دینا تھے۔ ..... سخت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ ایک عزیز سے جو صاحبِ ثروت بھی تھے اور ان کے والد کے مرہونِ منت بھی رہ چکے تھے روپے قرض مانگے۔ انھوں نے ..... حیلۂ شرعی کر کے ٹال دیا ..... اتفاق یہ کہ احسان فراموش کے ایک بزرگ کو اس واقعے کی خبر لگ گئی۔ انھوں نے پچھلا زمانہ یاد دلایا ..... اور خود ضمانت بھی کر لی۔ اُن حضرت نے مجبور ہو کر ایک عزیز کے ذریعے اب روپے بھیجے۔ مسعود صاحب نے کہا امتحان دے سکوں یا نہ دے سکوں اب اُن کے روپے نہ لوں گا۔ انھوں نے مجھے بے اعتبار سمجھا۔ دوسرے کی ضمانت ضروری سمجھی ..... بڑا اصرار کیا گیا۔ مگر مجروح خوددار اپنی بات پر اڑا رہا۔ شاید یہی انداز استغنا خدا کو پسند آگیا کہ بغیر کوشش و فکر کے دوسری جگہ سے قرض حسنہ مل گیا۔ امتحان میں بھی شریک ہوئے اور ممتاز حیثیت سے اُسے پاس کیا۔"

اسی خودداری کا نتیجہ ہے کہ ان کی کوئی تیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن انھوں

نے کوئی کتاب نہ کسی موجود شخصیت کے نام معنون کی، نہ کسی سے تبصرہ کرنے کی فرمائش کی۔ یہ اُن کی خودداری اور خود اعتمادی کا بیّن ثبوت ہے۔

دردِ سر۔ 'مختصر آپ بیتی' میں مسعود صاحب کے شدید دردِ سر کا بیان ہم ان کی زبان سے سن چکے ہیں۔ موصوف جب اس کا ذکر کرتے تھے تو شاہ حاتم کا یہ مصرع اکثر پڑھ دیا کرتے تھے: 'زندگی دردِ سر ہوئی حاتم'۔ علی جواد زیدی صاحب رقمطراز ہیں "آپ کا قلم اب بھی جواں سال ہے۔ ۱۹۰۸ء سے ہی آپ دردِ سر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن عام صحت اتنی اچھی تھی کہ اسے مستقل مزاجی سے جھیلتے رہے۔ اور اب بڑھاپے میں اسے بھی ہرا دیا۔ آپ کی ہمت مردانہ سے امید ہے کہ اس صحت کو برقرار رکھیں گے اور اپنی ادبی خدمات سے اپنی ذاتی حیثیت کو قومی حیثیت عطا کرتے رہیں گے۔" (آپ سے ملیے)

مسعود صاحب نے بڑھاپے میں دردِ سر کو ہرا دیا تھا مگر اب اسّی برس کی عمر میں بڑھاپے نے خود ان کو ہرا دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اب نہ دماغ حسبِ دلخواہ کام کرتا ہے نہ آنکھیں۔ نسیان اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو حسبِ منشا الفاظ یاد نہیں آتے۔ جس قلم نے ہزاروں صفحے لکھ ڈالے اب وہ ایک مختصر خط لکھنے میں تامّل کرتا ہے۔

کالج کی طالب علمی کا زمانہ

اس زمانے کے کچھ حالات علی عباس حسینی کے اس مضمون سے معلوم ہوتے ہیں جس کی نشان دہی اوپر کی جا چکی ہے۔ مضمون کی ابتدا اس تمہید سے کی گئی ہے: "میری شخصیت تین ذوات گرامی سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ ہیں نواب زادہ محمد مہدی رضوی ام، اے پٹنہ، مرزا احامد حسین ام۔ اے۔ ایل، ٹی لاہور اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ۔ نواب زادہ کی محبت نے مجھے دل کا گداز عطا کیا، مرزا کی دوستی نے مجھے زندگی برتنے کا سلیقہ دیا اور مسعود صاحب کے اخلاص نے مجھے خادم اردو بنایا۔ حق یہ ہے کہ اگر مسعود صاحب اس طرف توجہ نہ دلاتے تو میں انگریزی کا جرنلسٹ بن جاتا مگر اردو میں انشا پردازی کی

کا خیال کبھی دل میں نہ آتا۔ کالج میں تعلیم پانے کے زمانے میں اگر کوئی شوق تھا تو وہ انگریز کی طرح انگریزی بولنے کا اور لکھنے کا . . . . اردو کی لگن جو اب مجھ میں ہے وہ مسعود صاحب کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے "

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں " ۱۹۱۵ء میں جب میں ایف۔ اے کی تعلیم کے لیے لکھنؤ آیا تو وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے اور ہم دونوں شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے . . . . بورڈنگ ہاؤس دو منزلہ تھا۔ زیریں حصّے کے سینیر تھے سید غلام حسنین نقوی (جو اب حاجی ہو کر ہر طرح محترم بن گئے) اور بالائی حصّے کے مکرم تھے مسعود صاحب۔ میں اور مرزا حامد حسین ایف۔ اے کے طلبا ہونے کی وجہ سے اُن سے جونیر تھے۔ جس طرح مسعود صاحب متانتوں کا سرچشمہ تھے۔ اسی طرح مرزا شرارتوں کا منبع تھے۔ میرا معاملہ بین بین کا تھا۔ مسعود صاحب عام طور سے متین تھے مگر مخصوص احباب کی بزم میں ہنس مکھ بھی، بذلہ سنج بھی اور نقال بھی۔ مرزا نے تحریک پیش کی چونکہ قہقہہ اور ہنسی زندگی کو بڑھاتی ہے اس لیے حفظانِ صحت کے اصول کے ماتحت ایک قہقہہ کلب قائم کیا جائے جس کا مخصوص کام یہ ہوگا کہ ہم بالائی حصّے کے طلبا ہر روز سہ پہر کو ایک جگہ جمع ہو کر ہنسنے اور قہقہے لگانے کی ورزش کریں گے۔ مسعود صاحب کی ظاہری متانت نے دو ایک دن پس و پیش کرنے پر مجبور کیا، مگر فطری ظرافت غالب آئی اور وہ بھی اس انجمن قہقہہ بازان کے رکن بن گئے "

" طلبا کی انجمنوں کا جیسا دستور ہے بغیر کچھ کھائے پیئے ان میں زور اور گرمی نہیں آتی۔ اس لیے یہاں بھی قہقہے سے پہلے کچھ شغل نائے و نوشش ہوتا۔ یعنی کبھی مبکٹ کباب کھائے جاتے، کبھی آلو یا امرود کے کچالو، کبھی دہی بڑے اور پیاس بجھتی تھی فالسے کے شربت سے، کبھی لیمو کے شربت سے، کبھی صرف ٹھنڈے پانی سے "

" اب اس ناشتے کے لیے چندہ بھی ضروری تھا اور اس چندے کے لیے خزانچی بھی۔ یہ معزز عہدہ مسعود صاحب کو تفویض کیا گیا۔ اس لیے کہ اُن کے بارے میں اس زمانے میں

بھی یہ یقین تھا کہ یہ ایک پیسہ بھی کبھی خورد برد نہ کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ وہ فاقے کر سکتے ہیں، مگر امانت کی رقم نہیں چھو سکتے۔"

"اس طرح کی صحبتوں میں بھی مسعود صاحب کی شخصیت کی انفرادیت نہ جاتی تھی وہ کبھی اتنی زور سے نہ ہنستے کہ ہماری طرح پیٹ پکڑ کر لوٹنے لگیں، نہ کبھی غصہ ہوتے نہ جھنجھلاتے، نہ بزرگ داشت کا خیال ان کے ذہن سے محو ہوتا۔ بورڈنگ کے رہنے والے اکثر بے تکلفی یا جوشِ اخلاص میں ایک دوسرے سے ابے تبے، یا تو تکار بھی کر لیتے یہاں تک کہ مذاق کا سلسلہ بعض اصحاب کے درمیان فحش اور گالی گلوج تک پہنچ جاتا۔ مگر مسعود صاحب کا نام کسی کی زبان پر بغیر 'صاحب' کے نہ آتا اور نہ کوئی انھیں آپ کی جگہ تم کہہ کر مخاطب کرنے کی جرأت کرتا۔"

مسعود صاحب ہم ایسے بیراہ رو طالب علموں کے بھی ہیرو تھے اور طرح طرح سے اپنی افتادِ مزاج کے تحت ہم لوگوں کی قیادت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ہم کو یہ سمجھایا کہ ہم لوگ آپس میں ساری گفتگو انگریزی میں کیا کریں۔ کسی من چلے ساتھی نے کہہ دیا کہ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو کیا ہوگا۔ مسعود صاحب نے فرمایا کہ جو غلطی کرے اس کو فی لفظ ایک الائچی بطور جرمانہ دینا ہوگا۔ چنانچہ یہ طے ہو گیا اور ہم سب ہر وقت، اور ہر موقع پر ایک دوسرے سے انگریزی میں بات کرنے لگے۔ ایک مرتبہ دوپہر کا وقت تھا تعطیل کا دن تھا۔ ایک ہیجانی کیفیت میں آپس میں زوردار مکالمہ اردو میں ہو گیا۔ راقم الحروف' انحق مرحوم' الطاف صاحب اور مرزا سب ہی بدعہدی کے گنہ گار ہوئے۔ مسعود صاحب ملحقہ کمرے میں سب سنتے رہے اور جب ہم لوگوں کا مکالمہ ختم ہوا تو وہ ہمارے سامنے آئے، فردِ قراردادِ جرم سنائی اور جرمانہ ادا کرنے کا حکم سنایا۔ کسی پر سوا الائچی سے زیادہ کسی پر پچاس کے لگ بھگ۔ مختصر یہ کہ سب نے سزا قبول کی اور جرمانہ ادا کیا۔ لیکن ہم سب کو حیرت تھی کہ انھوں نے ہم سب کے منھ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ

کیسے گن لیا" یہ واقعہ اس زمانے میں طلبا کے تفریحی مشاغل پر روشنی ڈالتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح کرتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی مسعود صاحب کس قسم کے تفریحی شغلے پسند کرتے تھے۔ ان کے فطری ادبی ذوق پر یہ واقعہ پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔

الٰہ آباد میں اصحابِ ثلاثہ کا سنگم ۱۹۱۹ء

علی عباس حسینی: "بی۔اے پاس کرنے کے بعد جب میں اور مرزا ٹرننگ کالج الٰہ آباد میں داخل ہوئے تو مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت صیغۂ تعلیم کے کیٹلاگ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور رانی منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا ہر اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے ہاں پہنچ جاتے، دن بھر اپنے ہاتھ سے طرح طرح کے کھانے پکائے جاتے اور مختلف ادبی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب و انیس پرست تھے، لیکن ایک دوسرے کو جلانے اور تپانے کے لیے کبھی کبھی ان اصنام ادب و سخن پر بھی خشت باری کر دیتے۔ اس ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا بعض حیثیتوں سے ذوق، غالب سے بڑے شاعر تھے۔ میں نے کہا وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے۔ موزوں کر لینا اور چیز ہے اور شعر کہہ لینا اور شے۔ بڑی گرما گرم بحث رہی۔ بالآخر حکم مسعود صاحب بنائے گئے "......

اعتراف قابلیت ۔ مرزا محمد عسکری ۱۹۴۲ء: "لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے افسر اعلیٰ ہیں۔ آپ لکھنؤ بلکہ پورے صوبے میں تعلیمات علی الخصوص اردو اور فارسی کے تعلیمات کے ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں اور الحق ایسا ہی ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں بعض گول آدمی مربع سوراخوں میں اور مربع آدمی گول سوراخوں میں دھرے ہوئے ہیں، جو کسی طرح فٹ نہیں ہوتے۔ مگر مسعود صاحب اپنی کرسی کی زینت ہیں اور اپنے جلیل عہدے کے لیے نہایت موزوں اور مناسب۔ فارسی کی قابلیت کے علاوہ آپ کی زبان اردو کی قابلیت قابل رشک ہے۔"

۹۷۷۶

انیس احمد عباسی ۱۹۵۲ء: "آپ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی واردو کے انچارج ہیں اور اپنی ٹھوس علمی وادبی قابلیت سے آپ نے براعظم ہند میں (جس میں پاکستان بھی شامل ہے) اردو کے ادیبوں کی صفِ اول میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ راقم السطور کی رائے میں موصوف کو فنا فی الاردو کہنا چاہیے۔ خاص لکھنؤ میں سید مسعود حسن صاحب کی علمی وادبی قابلیتوں کی اتنی قدر کی جاتی ہے کہ اردو کی جس ادبی صحبت میں موصوف شریک نہ ہوں، وہ محفل بے چراغ سمجھی جاتی ہے۔"

"موصوف اردو زبان کے فاضل اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی اردو کے عاشق بھی ہیں جس کی بقا وترقی کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔"

علی عباس حسینی ۱۹۵۶ء: "وہ ہندی، انگریزی اور فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے وہ بلند تر ادیبوں ہی میں نہیں بلکہ اس کے موجودہ دور کے محسنین میں سے ہیں۔ انھیں الفاظ کے استعمال پر بے پناہ قدرت ہے۔ ان کا ہر فقرہ جچا تُلا، سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ ایسے علوم میں بھی جن میں انھیں دستگاہ کامل حاصل نہیں ہے وہ 'یک من علم را دہ من عقل باید' کے مصداق ہیں۔"

ڈاکٹر صفدر آہ ۱۹۶۸ء: "۱۹۲۲ء میں جب ادیب صاحب بحیثیت لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی میں آئے تو وہ ایک صاحبِ مطالعہ بالغ نظر نوجوان تھے اور لکھنؤ کے علمی اور ادبی حلقوں میں اُن کا کافی احترام ہوتا تھا۔"

ادبی اور علمی جماعتوں سے وابستگی

مسعود صاحب کو انجمنوں میں شرکت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن بعض انجمنوں کی رکنیت بھی قبول کی اور بعض کے عہدۂ صدارت پر بھی فائز رہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں "عمر بھر سرکاری اور غیر سرکاری علمی وادبی انجمنوں کے ممبر رہے مگر سوائے مسلم اکاڈمی لکھنؤ اور انجمن اردو لکھنؤ کے کسی ادارے میں کوئی عہدہ نہ قبول کیا۔ ان دونوں جماعتوں کی

عہدہ داری سے انھیں تجربہ ہو گیا کہ خاموش ادبی کام کرنے والوں کے لیے انجمن بازی تضیع اوقات ہے۔"

انیس احمد عباسی نے اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں "لکھنؤ کی مسلم اکاڈمی میں جس کو مولانا عبدالحلیم شرر نے قائم کیا تھا۔ سید مسعود حسن صاحب کا زیادہ قریب سے مطالعہ کرنے اور ان کی علمی و ادبی قابلیتوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ موصوف دو سال تک اکاڈمی کے صدر بھی رہے۔ راقم السطور بھی شروع سے اکاڈمی کا ممبر تھا جس کے ارکان میں مرزا محمد عسکری صاحب مرحوم، مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی مرحوم، شفاء الملک حکیم شمس الدین صاحب، ڈاکٹر وحید مرزا صاحب، مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری، علامہ سید جالب دہلوی مرحوم اور لکھنؤ کی دیگر ممتاز ہستیاں شریک تھیں[1]۔"

---

[1] مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے روزنامہ قومی آواز، لکھنؤ مورخہ ۶ جون ۱۹۷۱ء کے ضمیمے میں مسلم اکاڈمی کے آغاز اور اختتام کے بیان میں لکھا ہے "مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں ایک مسلم اکاڈمی قائم کی تھی جس کے جلسے ماہانہ ہوتے تھے۔ کوئی اہل علم اور اہل قلم اس میں اپنا مقالہ پڑھتا تھا۔۔۔۔ مسلم اکاڈمی کے بنیادی ممبروں میں جہاں تک مجھے علم ہے اب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی بقید حیات ہیں۔۔۔۔ آخر میں مولانا عنایت اللہ مرحوم اس کے صدر ہو گئے اور ان کی صدارت غالباً ان کے انتقال پر ختم ہوئی (۱۹۴۲ء میں)۔ اس کے بعد مسلم اکاڈمی بھی معطل ہو گئی۔ ۱۹۴۹ء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس کو زندہ کرنا چاہا اور مجھے سکریٹری نامزد کر دیا۔ اس وقت تقسیم ہند ہو چکی تھی، بہت سے ممبر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔۔۔۔ پروفیسر صاحب اور حکیم (خواجہ شمس الدین) صاحب اور سید احمد حسین صاحب تین ممبر رہ گئے تھے۔ میں بھی صحافت کے گرداب میں پھنستا چلا گیا۔۔۔۔ چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی۔"

"شروع ہی سے سرکاری وغیر سرکاری ادبی و علمی اداروں میں سید صاحب کو اردو ادب کے ماہرین میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں گورنمنٹ آف بہار اینڈ اڑیسہ نے ورناکیولر ڈولپمنٹ کمیٹی قائم کی اس کے آخری جلسے میں اردو کے کچھ ماہرین کو صوبے کے باہر سے بھی بلوایا۔ لکھنؤ سے سید جالب صاحب مرحوم اور سید مسعود حسن صاحب ماہرین اردو کی حیثیت سے بلائے گئے۔"

مارچ ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے جامعۂ ملیہ دہلی کے تفصیلی معائنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کے ایک ممبر آپ بھی تھے [یہ کمیٹی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی اس درخواست پر مقرر کی گئی تھی کہ دہلی یونیورسٹی جامعہ ملیہ کی سند کو تسلیم کر لے۔]

۱۹۴۶ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا دو سالہ اجلاس جوناگڑھ میں ہوا تھا اس کے اردو سیکشن کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے [اور وہ معرکہ آرا خطبۂ صدارت پیش کیا جو بعد کو 'اردو زبان اور اس کا رسم خط' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔]

"صوبے کے اندر اور باہر کی متعدد یونیورسٹیوں کی مختلف کمیٹیوں کے آپ برابر ممبر ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر الٰہ آباد یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اکزیکیٹو کاؤنسل کی ممبری ہے۔" [صدر جمہوریہ نے یونیورسٹی کے وزیٹر کی حیثیت سے متواتر تین مرتبہ یونیورسٹی کی اکزیکیوٹیو کاؤنسل کا ممبر نامزد کیا۔"]

"ہندوستانی اکاڈمی یوپی کے اس کی ابتدا سے یعنی ۱۹۲۷ء سے آج تک ممبر ہیں۔ کل ہند انجمن ترقی اردو اور اس کی مجلس ادبی اور مجلس عاملہ کے ممبر بھی ہیں۔"

عباسی صاحب کا بیان ہے کہ "اردو کی جس ادبی صحبت میں موصوف شریک نہ ہوں وہ محفل بے چراغ سمجھی جاتی ہے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں مسعود صاحب ادبی صحبتوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ لیکن راقم حروف نے گزشتہ پندرہ سولہ برس کی طویل مدت میں ان کو محفلوں اور جلسوں سے بالکل کنارہ کش دیکھا۔ ان کو اپنی تصنیفی مصروفیتوں

سے کہیں جانے آنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔
مذہبیت۔ مسعود صاحب میں مذہبی تنگ نظری نہیں ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروؤں سے ان کے خوشگوار تعلقات ہیں۔ وہ اپنے اور دوسروں کے مذہبی عقائد پر کبھی گفتگو نہیں کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی جذبات کی ایک جھلک ان کے ایک خط میں نظر آتی ہے جو انھوں نے اپنے زمانۂ شباب میں ایک بے تکلف دوست کو لکھا تھا۔ یہ خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اس سے پہلے آپ کے اخبار کے دو نمبر وصول ہو چکے تھے۔ پہلے نمبر میں وہ مضمون جس کا عنوان ہے 'WHO IS WHO' دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا کو انسان کا مخلوق کہنا اور خدا پرستی کو جنسی قرار دینا فکری کج روی کی انتہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ خیالات آپ کے ذہنی اختراعات نہیں ہیں۔ مگر سطح بینی اور تقلید پرستی کی آخر کوئی حد بھی ہے۔ آپ نے نوع انسانی کے حقیقی رہنماؤں کا دامن چھوڑ کر جس شخص سے عقد عقیدت باندھا ہے اس سے بڑا جنسی مریض تصور میں نہیں آسکتا۔ اس کے سر پر جنس کا بھوت سوار ہے اور اس کو ہر شے میں جنس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ایسے گمراہ مفکروں کی تقلید ہر طرح جنسی، اخلاقی، سماجی بے راہ روی کے لیے ایک وجہ جواز پیدا کر کے احساس گناہ کی صلاحیت کو فنا کر دیتی ہے۔ اس طرح انسان کے اندر جو حیوان یا شیطان چھپا ہوا ہے اس کو ان کے فلسفے کی آڑ میں کھل کھیلنے کا پورا موقع مل جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ ضمیر کی خلش سے نجات پانا اور انسانیت کے کڑے مطالبوں سے فرار کر کے حیوانی آزادی کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں، وہ اس فلسفے کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ فراریت کی بزدلی کو بہادری اور جرأت کا مظاہرہ قرار دے کر دوسروں کو اور خود اپنے کو دھوکا دیتے ہیں۔ بہر حال میرے متعلق آپ اتنا

تو جانتے ہیں کہ میں بے دینی، بدکاری، اور مےخواری کی تبلیغ کا ساتھ نہیں دے سکتا اور اس لیے جس اخبار میں ایسے مضامین شائع ہوتے ہوں اس کا خریدار نہیں بن سکتا۔"

بے تعصّبی ۔ مسعود صاحب جن تحریکوں میں شامل ہوئے اور جن اداروں کے ذمّہ دار رکن رہے وہ سب ایسے ہیں جن کے دروازے ہر مذہب و ملّت کے لیے کھلے ہوئے ہیں جیسے یادگار انیس کمیٹی (انیس میموریل کمیٹی)، انجمن یادگار حسینی، میر انیس صد سالہ تقریبات کمیٹی۔

مسعود صاحب کے نیازمندوں اور پرخلوص دوستوں میں اگر ایک طرف علی عباس حسینی کے سے زاہد خشک تھے تو دوسری طرف میرا سا رند بے پروا اخرام بھی ہے۔ مسعود صاحب کی پرخلوص محبت میں میرا بھی اتنا ہی گراں قدر حصہ رہا ہے جیسا حسینی مرحوم کا تھا اور ان کی انسانیت پرست دوستانہ روش نے ہمارے ایسے لوگوں کے درمیان کبھی مخلصانہ برتاؤ میں امتیاز نہیں برتا۔

شادی ۔ مسعود صاحب کو ایک اچھی شریک زندگی کی تلاش تھی۔ انھیں جاہ و حشمت اور مال و دولت کی خواہش سے کوئی علاقہ نہ تھا لہٰذا اس قسم کے رشتوں کی طرف کوئی التفات نہ کیا اور آخرکار اپنے معیار کے مطابق صحیح شریک حیات کا انتخاب کر لیا۔ مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں کہ "آپ کا ایک جملہ ازدواج کے متعلق آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آدمی ایسی جگہ شادی کرے کہ لوگ سسرے کو دیکھ کر کہیں کہ یہ فلاں کے سسرے ہیں نہ کہ داماد کو کہ یہ فلاں کے داماد ہیں۔"

حسینی صاحب کا بیان ہے" اسی خودداری نے انھیں شادی کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ میٹرک پاس کرتے ہی ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی۔ مکان و اثاثہ، گاڑی گھوڑا سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ مگر انھوں نے کہا" الفقر فخری"۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور و مقتدر

تعلقہ دار کے یہاں سے اسی طرح کی خواہش کی گئی۔ بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انھوں نے کہا " شادی کے معاملے میں میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں فلاں صاحب مسعود صاحب کے سسر ہیں۔ نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں یعنی دامادی ذریعہ عزت و ترقی و امتیاز نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت!"

طبیب حاذق حکیم سید محمد یوسف جعفری نعمت اللہی امام جعفر صادق علیہ السلام کی اولاد ایران کے نامور عارف اور شاعر شاہ نعمت اللہ ولی کے اخلاف میں لکھنؤ کے باشندے تھے۔ لیکن کانپور جا کر محلہ ٹپکا پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں انھوں نے ایک امام باڑہ اور اس کے متعلق چند مکانات وقف علی الاولاد کر دیے تھے۔ امام باڑہ ٹپکا پور میں اب تک موجود ہے۔ حکیم سید محمد یوسف کے فرزند اکبر حکیم سید محمد اصغر نعمت اللہی معروف بہ حکیم پیارے صاحب معززترین میں شمار ہوتے تھے اور کانپور میں اپنے وقت کے سب سے نامور طبیب تھے۔ ٹپکا پور میں سکونت بھی تھی اور مطب بھی۔ آپ کی اہم باشمی صاحبزادی "حسن جہاں بیگم عرف حسینہ بیگم" کے ساتھ ۲۹ رجب ۱۳۴۴ھ کو مسعود صاحب کا عقد نکاح ہوا اور ۱۵ شعبان المعظم ۱۳۴۴ھ یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو رخصتی عمل میں آئی۔

متاہل زندگی ۔ اس وقت سید مسعود حسن صاحب جوہری محلہ لکھنؤ کے ایک وسیع مکان میں مقیم تھے۔ اہلیہ رخصت ہو کر وہیں آئیں۔ معظمہ کے باپ، دادا، چچا کئی بزرگ نامی طبیب تھے۔ حکمت کے سیکڑوں چٹکلے ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی تدبیر دلی سے گھر میں حکیم اور ڈاکٹر کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ شوہر کے معاملے میں بھی بیرونی علاج معالجے کے بجائے گھریلو دواؤں اور چٹکلوں سے کام لیا اور ایسا مداوا کیا کہ وردِ سر کے مریض شوہر عمر بھر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہ سکے۔

محترمہ کو ادب کا ذوق اور ادبی خدمت کا شوق بھی تھا۔ ان کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ

یہ ہے کہ اردو کی تقریباً سات سو شلیں جمع کرلیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے معانی و مطالب سمجھنے کی نوبت نہ آئی۔ شوہر اور زوجہ کے مزاج اور مذاق کی موافقت ایک بڑی نعمت ہے۔ محترمہ اپنے شوہر کی طرح انیس کی شیدائی تھیں اور ان کے مراثی کے سینکڑوں بند یاد تھے۔ بلکہ یہ بھی حافظے میں محفوظ تھا کہ فلاں مرثیہ فلاں جلد میں ہے اور فلاں بند فلاں مرثیے میں ہے۔ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ادیب بارہا مراثی انیس کی ضخیم جلدوں کی ورق گردانی سے بچ گئے۔

شریک زندگی کی رحلت۔ یہ نیک طینت بی بی تینتالیس[43] سال سات مہینے بائیس[22] دن تک شوہر کی شریک زندگی رہیں۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو دن گزر کر ۲۳ اکتوبر کی رات کو ساڑھے بارہ بجے قلبی دورے میں اچانک دنیا سے کوچ کر گئیں اور ۲۳ اکتوبر ۴ بجے سہ پہر کو منشی فضل حسین خاں کی کربلا میں سپرد خاک کی گئیں۔ حسب ذیل کتبہ مرحومہ کے مزار کی نشان دہی کرتا ہے:

حسن جہاں بیگم جعفری بنت حکیم سید محمد اصغر مرحوم نعمت اللّٰہی اہلیہ سید مسعود حسن رضوی ادیب

تاریخ وفات ۱۰ شعبان ۱۳۸۹ ہجری، ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ عیسوی

سُنا ہے کہ مرحومہ کی آخری تمنّا یہ تھی کہ شوہر کے سامنے اولاد کی سلامتی میں دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ اُن کی یہ تمنّا بھی پوری ہو گئی۔

مسعود صاحب کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بیان میں ہم دو تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تحریر ایک مخلص دوست کے تعزیت نامے کا جواب ہے، دوسری تحریر جلیل القدر نقاد پروفیسر احتشام حسین کا تعزیت نامہ ہے۔ پہلی تحریر سے خود مسعود صاحب کے دلی تاثرات کا سراغ ملتا ہے، دوسری تحریر سے مرحومہ کی نیک طینتی اور ہر دلعزیزی کا اظہار ہوتا ہے۔

مخلص نواز عزیز محترم دکھے ہوئے دل سے نکلی ہوئی دعائیں لیجئے۔

اہلیہ مرحومہ کی وفات پر آپ کا تعزیت نامہ ملا۔ آپ کے پرخلوص جذباتِ ہمدردی میرے خستہ وشکستہ دل کی تسکین کا باعث ہوئے۔ لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کا فرمان ہے

دل بدست آور کہ حج اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

آپ نے اس فرمان کی صدق دل سے تعمیل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حج اکبر کا ثواب عطا کرے۔ آپ نے میری دلجوئی کی غرض سے مجھ کو کچھ دن اپنے یہاں قیام کرنے کی دعوت دی ہے اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کی پیش کش کی ہے۔ گزشتہ اپریل میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران میں آپ کی مہمان نوازی اور خاطر داری کا ناقابل فراموش تجربہ کر چکا ہوں۔ لیکن وہ شاید میرا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد سے اب تک نہ کہیں گیا نہ جانے کا ارادہ ہے۔ اور اب تو اپنی محبوب ترین شریک حیات کی دائمی مفارقت کے جاں فرسا سانحے کے بعد میری حالت یہ ہو

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائے گا

ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا

اور آپ سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اس وقت شہر شہر سے آئے ہوئے عزیز سوگواروں سے گھر بھرا ہوا ہے لیکن چند روز میں یہ عارضی آبادی ویرانی میں تبدیل ہو جائے گی۔

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہو لیکن ہر گوشۂ چمن میں خالی ہو جائے بلبل

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں ۔۔۔۔ آج بلبل نہیں گلستاں میں

زندگی کی گاڑی جو دو پہیوں پر بڑی ہموار رفتار سے چلی جا رہی تھی اس کا ایک پہیہ نکل گیا اب اسی حالت میں اس کو کھینچ کر آخری منزل تک پہنچانا ہو۔

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

یونیورسٹی آف الہ آباد

الہ آباد

تاریخ ۲۷ اکتوبر ۶۹ء

مخدومی و محترمی تسلیم

محترمہ بھابی صاحبہ کے اچانک انتقال کی خبر ملی اور کمال صدمہ ہوا۔ زندگی اور موت کے کھیل میں زندگی ایک بازی پھر ہار گئی اور آپ ایک حیثیت سے بالکل تنہا رہ گئے۔ یوں تو بھرے پُرے گھر میں ایک ہی فرد کی کمی ہوئی ہے لیکن ایک ایسی فرد کی جس کی حیثیت آپ سے بھی زیادہ مرکزی تھی۔ یہ بات غم میں اور اضافہ کرتی ہے۔ احساسات یہی ہیں لیکن عقل کہتی ہے کہ صبر کی تلقین کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہیئے، موت حیاتِ بشری کا لازمی جُزو ہے اور بے بسی صبر کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دکھاتی۔ یہ انسان کا مقدر ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو اور سارے عزیزوں کو صبرِ جمیل عطا کرے اور مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے جس کے لیے انھوں نے اس دنیا ہی میں بہت سامان کر لیا تھا۔ ان کی ذات میں جو خوبیاں اور نیکیاں جمع تھیں وہ بھی باعثِ تسکین بنیں گی کیونکہ ان کے تذکرے سے انسان کی شرافت اور نیکی پر اعتماد تازہ ہوتا ہے۔

اہلیہ اتفاق سے لکھنؤ میں تھیں انھوں نے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی بے قراری اور غم کا تذکرہ جس طرح کیا اس سے دل بھر آیا۔ اب آپ پر یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے ثبات قدم سے عزیزوں کے دل کو تقویت بخشیے، یقیناً ان کو بھی اس فرض کا احساس ہوگا کہ پہلے سے زیادہ آپ کی دلجمعی کا ذریعہ بنے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عزیزی نیر مسعود اور ان کے بھائی اور برادرم آفاق صاحب اپنے غم کو بھلا کر آپ کی ڈھارس اس طرح بندھائیں گے کہ آپ کے قلب و دماغ پر مزید بار نہ پڑے یہاں تک کہ وقت خود زخم کے اندمال کی تدبیر کرے! خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

شریک غم

احتشام حسین

مرحومہ اپنے والد کی وفات کے بعد سے آخر وقت تک اپنے دادا کے وقف کیے ہوئے امام باڑے کی متولیہ رہیں۔

اخلاف۔ مرحومہ نے چار بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ بیٹیاں ان کی زندگی میں اپنے اپنے گھر کی ہو کر مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ بیٹے اپنی تعلیم ختم کر کے برسرکار ہو چکے تھے۔ مرحومہ کی اولاد کے نام ترتیب وار درج کیے جاتے ہیں:

ارجمند بانو بیگم: ۴ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ (۲۸ نومبر ۱۹۲۷ء) کو پیدا ہوئیں۔ سید مسیح الزماں نقوی جائسی کے ساتھ شادی ہوئی جو الہ آباد میں یونیورسٹی لکچرر تھے اور اب بنارس ہندو یونیورسٹی میں ریڈر اور شعبہ اردو و فارسی کے صدر ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی نے آپ کی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقا" پر ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی ڈگری دی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اختر مسعود رضوی: ۷ صفر ۱۳۴۸ھ (۲۵ جولائی ۱۹۲۹ء) کو پیدا ہوئے۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کرکے پی ایچ ڈی کیا۔ اب بیتا ور یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی عارضی طور پر فارسی کے لکچرر رہ چکے ہیں۔

برجیس بانو بیگم: ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ (۱۳ ستمبر ۱۹۳۱ء) کو پیدا ہوئیں۔ سلطان پور کے رئیس سید غلام مہدی صاحب کے فرزند سید آباد حسین ایم۔ اے سے شادی ہوئی۔ اب شوہر کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تحصیل علم میں بھی مصروف رہیں اور ۱۹۶۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں اردو میں ایم۔ اے کرلیا۔

انیس بانو بیگم: ۳ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ (۳۰ مارچ ۱۹۳۳ء) کو پیدا ہوئیں۔ اپنے خاندان ہی میں سید حبیب حسین کو منسوب ہوئیں جو سعودی عرب، سوڈان، کناڈا کے بعد اب کیلی فورنیا (امریکہ) میں بحیثیت انجینیر مامور ہیں۔

نیر مسعود رضوی: ۷ شعبان ۱۳۵۳ھ (۱۶ نومبر ۱۹۳۴ء) کو پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے کرکے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ڈی فل کی ڈگری اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر نیر مسعود ان ہونہار نوجوانوں میں ہیں جو ادبی دنیا میں جلد ہی اپنی جگہ بنا لیں گے۔ ان کی پہلی کتاب رجب علی بیگ سرور پر الہ آباد یونیورسٹی نے ڈاکٹر کی سند دی اور شعبۂ اردو کی طرف سے اس کو شائع کیا۔ حکومت یو۔ پی اور میر اکیڈمی، لکھنؤ نے اس کتاب پر انعامات دیے۔ ان کی اس بلند پایہ کتاب اور بعض عالمانہ مقالات سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے پدر بزرگوار کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔

انور مسعود رضوی: ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ (۵ جولائی ۱۹۳۷ء) کو پیدا

ہوئے رہائی اسکول پاس کرنے کے بعد نیشنل ہومیو پیتھک کالج، لکھنؤ سے پانچ سال کا کورس پاس کر کے پرائیویٹ پریکٹس شروع کی۔ کچھ مدت بعد موہن ہومیو پیتھک کالج، لکھنؤ میں ملازمت کر لی۔ ذاتی پریکٹس بھی کر رہے ہیں۔

اطہر مسعود رضوی: ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ (۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء) کی رات کو پچھلے پہر پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم۔ اے کر کے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ کچھ مدت پی ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی کام کیا اور اب اپنے مکتبے "کتاب نگر" کے مالک کی حیثیت سے معیاری کتابوں کی طباعت و اشاعت میں مصروف ہیں۔ نہایت مہذب، شگفتہ رو، سلیقہ شعار نوجوان ہیں۔

بہن اور بھائی۔ مسعود صاحب کی ایک چھوٹی بہن اور ان سے چھوٹے ایک بھائی ہیں۔ بہن سیدہ بیگم اپنی ایک بیٹی بلند اختر اور دو بیٹوں ہاشم آغا اور اقبال حامد کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔ بیٹی ایلوپیتھک ڈاکٹر اور بیٹے دونوں انجینیر ہیں۔ تینوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل یورپ اور امریکہ میں کی ہے اور اپنے اپنے شعبے میں نیک نامی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسعود صاحب کے بھائی سید آفاق حسین رضوی آزاد منش، خوش وضع، خوش طبع، خوش مذاق شخصیت کے مالک ہیں۔ آزمودہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹر اور اس طریقۂ علاج کے زبردست مبلغ ہیں۔ جوانی میں ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی، اعلیٰ درجے کی ٹیموں کے ممبر اور بعض کے کپتان رہ چکے ہیں۔ ورزش جسمانی کے مختلف طریقوں کے ماہر ہیں۔ ایک زمانے میں مکان کے ایک حصے کو آلات ورزش سے آراستہ کر کے اچھا خاصا ورزش خانہ بنا دیا تھا، جہاں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ورزش کی اصولی اور عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عمر ساٹھ سے متجاوز ہے۔ لیکن بڑے بھائی کا احترام سعادت مند اولاد کی طرح کرتے ہیں اور بھتیجوں بھتیجیوں کو باپ سے زیادہ

چاہتے ہیں۔ ساری عمر حضرت ادیب کے ساتھ رہے۔ ادب کا اچھا مذاق رکھتے ہیں
انیس کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ مراثی انیس کے طویل اقتباسات نوکِ زبان
ہیں، جنھیں پرزور انداز میں ادا کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایران و عراق کے عتباتِ
عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔

اپنی بھانجی صاحب سے بہت بے تکلف رہے۔ مرحومہ گھر گرہستی کے تمام
کاموں میں، اُن کو شریک رکھتی تھیں۔ اولاد کی تربیت اور شادی بیاہ کے معاملات
میں مسعود صاحب سے زیادہ آفاق صاحب دخیل اور عامل رہے۔ بچوں میں انھیں
چچا سے زیادہ بے تکلف دوست کی حیثیت حاصل رہی۔

عشق و محبت۔ ادیب نے زندگی کی جو حدیں مقرر کر رکھی ہیں ان کی وجہ سے ان
کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان کی
نفاست طبع، رقت قلب اور شاعرانہ مزاج سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ حُسن
کی کشش اور عشق کے جذب سے غیر متاثر نہ رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کوئی ادیب
اپنے جذبات پر کتنے ہی پردے ڈالے اس کی تقریر و تحریر سے حقیقت حال بھوٹ ہی
نکلتی ہے۔ حسینی صاحب اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کا مطالعہ کرتے رہے
ہیں۔ ان کی باریک بین نگاہ اس پوشیدہ حقیقت تک پہنچ گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"صنفِ نازک کا ذکر مجھ جیسے بے تکلف دوستوں سے کبھی نہ کیا۔ بظاہر
وہ اس کے قائل ہیں کہ "عشق عصیان است، اگر مستور نیست"۔ لیکن
ہماری شاعری میں انھوں نے معاملات عشق کا بیان جس تفصیل سے کیا
ہے اور اس سلسلے میں جو پتے پتے کی باتیں لکھی ہیں ان سے غالب کا یہ
شعر یاد آجاتا ہے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ۔۔۔ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"

ادبستان ۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم ہونے کے بعد جوہری محلہ کے ایک وسیع مکان میں قیام کیا۔ یہ مکان لکھنؤ کے بہت نامی طبیب شیخ علی محمد مرحوم کا امام باڑہ تھا۔ مسعود صاحب کے والد کو طبابت کا اجازہ یعنی سند انھیں حکیم صاحب نے دی تھی۔ اصل اجازہ عربی زبان میں بہت خوش خط طلائی اور رنگین لوح اور جدولوں کے ساتھ بہت اچھے کاغذ پر لکھا ہوا مسعود صاحب کے پاس موجود ہے۔

مسعود صاحب کی شادی اسی مکان سے ہوئی تھی اور ان کی شریک حیات رخصت ہو کر اسی مکان میں آئی تھیں۔ مکان بہت وسیع اور آرام دہ تھا مگر بیگم صاحبہ کو کرائے کے مکان میں رہنا بہت ناگوار تھا۔ آخر اُن کے اصرار پر اور انھیں کے نام سے محلّہ اشرف آباد میں دین دیال روڈ پر ایک بہت وسیع مکان خرید کر اپنے مزاج کے موافق اس کی تعمیر میں بہت کچھ صرف کیا اور ادبستان نام رکھ کر اس کو اسم با مسمّیٰ کر دیا۔ ادبستان کے سر بلند برج اور بالائی منزل کی جاذب نظر عمارت دور ہی سے راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگتی ہے۔

ادبستان کا بیرونی مردانہ حصّہ نسبتاً جدید وضع کا ہے جس میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، بیڈ روم، آفس روم، باتھ روم وغیرہ ہیں اور سامنے طویل و عریض برآمدہ اور پختہ چبوترہ ہے۔ اُس کے آگے کیا ڈنڈ کا وسیع میدان ہے۔ بیڈ روم میں دو مسہریاں، چند کرسیاں اور ذاتی ضروری سامان موجود رہتا ہے۔ ایک مسہری کے چوبی تکیے سے ملا ہوا گاؤ تکیہ رکھا رہتا ہے جس کے سہارے سے بیٹھ کر پڑھتے لکھتے ہیں۔ میز کرسی پر بہت کم کام کرتے ہیں۔

ادبستان کا اندرونی حصّہ یعنی زنان خانہ مشرقی انداز کی شاندار عمارت ہے۔ بہت کشادہ صحن کے چاروں طرف متعدد کمرے، دالان، صحنچیاں، کوٹھریاں، باورچی خانہ اور کئی حمام ہیں۔ ادبستان کی پشت پر ملازموں کے لیے کوارٹر، گودام، موٹر خانہ وغیرہ ہیں۔

ادبستان کی دوسری منزل جو تمام و کمال مسعود صاحب کی تعمیر کردہ ہے کئی حیثیتوں سے اپنی وضع میں منفرد ہے۔ اس کے سہ در، اس کے ستون، اس کی سی پوری رو کار کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔

مرزا محمد عسکری کا بیان ہے "مکان آپ کا دین دیال روڈ پر عرش سے فرش تک یعنی چھت سے زمین تک، آپ کی جدت طبع اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے۔"

علی جواد زیدی لکھتے ہیں "مسعود صاحب سے ملنے کے لیے آپ کو تھوڑی سی مسافت طے کرنا ہوگی۔ وہ پرانے لکھنؤ کے محلہ نخاس سے بھی کچھ آگے دین دیال روڈ پر ادبستان نامی عالی شان مکان میں رہتے ہیں۔"

مکان کا پتہ بتانے کے بعد لکھتے ہیں "آپ کا موجودہ مکان ادبستان بھی سادگی اور شان کا مرقع ہے۔ اسے دیکھ کر یہ خیال فطری طور پر ذہن میں آتا ہے کہ اگر مسعود صاحب کو اتنی دولت صرف کرکے ایسا مکان بنوانا ہی تھا تو انھوں نے لکھنؤ کے کسی نئے علاقے میں کم آبادی والے محلے اور کشادہ رقبے میں کیوں نہیں بنوایا، جہاں انھیں سکون بھی ملتا اور اس سے زیادہ صاف و شفاف آب و ہوا بھی۔ دوسرے علاقوں میں انھیں سکون و صفائی تو مل جاتی، لیکن انھیں وہ لکھنؤ کہاں ملتا جس کے وہ دلدادہ ہیں! غالباً اسی لیے انھوں نے قدیم لکھنؤ، مطعون لکھنؤ کا یہ گوشہ اپنی رہائش کے لیے تجویز کیا۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"جس مکان میں رہتے ہیں اس کا نام ادبستان ہے۔ یہ نام دو حیثیتوں سے موزوں ہے۔ ایک، تو اس میں مسعود صاحب کا وہ قیمتی کتب خانہ ہے جو کئی اعتبار سے بے نظیر ہے اور دوسرے اس میں خود مالک مکان کئی برس سے شب و روز خدمت ادب میں معروف ہیں۔ ادب ہی مسعود صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔[1]" (تحقیق نمبر)

---

[1] ماہنامہ "آجکل" دہلی اردو تحقیق نمبر، اگست، ۱۹۶۷ء۔ اردو تحقیق کے چند سنگ میل اور ستون ص۲

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد

نورالحسن ہاشمی: "آج کل مسعود صاحب اردو ڈرامے پر خصوصاً اندر سبھا امانت پر بعض بڑی نادر کتابوں کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب تیار کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ جلد منظر عام پر آجائے گی اور اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں بعض نئی معلومات کا ذریعہ بنے گی۔ اسی طرح اردو مرثیہ بالخصوص انیس کی مرثیہ نگاری پر بھی بہت کچھ تو موصوف لکھ چکے ہیں اور جتنا کچھ لکھنا باقی ہے اس کے لیے بھی سب مواد اکٹھا ہے۔ اردو ڈرامے کے بعد امید ہے یہ چیز بھی خاصے کی چیز ہوگی اور آخر میں واجد علی شاہ پر بھی بہت کچھ لکھنے کا پروگرام ہے، جس میں خصوصیت سے واجد علی شاہ کی ادبی زندگی کے بعض ایسے گوشے پیش کیے جائیں گے جو آج تک نظروں سے اوجھل ہیں اور جن کے علم کے بعد ممکن ہو کہ وہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو اب تک واجد علی شاہ کے نام سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔"

"خدا کرے موصوف کا یہ جتنا کچھ لکھنے کا پروگرام ہے بوجہ احسن اور جلد پورا ہو جائے کیونکہ شائقین عرصے سے مشتاق ہیں اور اب ریٹائر ہونے کے بعد امید ہے خود مسعود صاحب کو ان ادبی کاموں کو انجام دینے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے گا۔ ہاں خدا کرے ان کا رفیق قدیم یعنی دردِ سر اب اُن کے کاموں میں سدِّ راہ نہ ثابت ہو۔"

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے نو سال بعد ادبیات کی تحقیق و تدریس کے لیے ریسرچ پروفیسر مقرر کر کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یکم اگست ۱۹۶۳ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۶۶ء تک گراں قدر وظیفہ دیا اور ادیب نے اُس سے زیادہ گراں ارز خدمات انجام دیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی بعض خدمات

نورالحسن ہاشمی: "تیس بتیس برس جو آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت معلم کے

گزارے ہیں وہ یادگار رہیں گے۔ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں بھی اردو اور فارسی مخطوطوں کا ایک بہت اچھا ذخیرہ آپ نے مہیا کر دیا ہے۔ اردو بحیثیت ایک مضمون کے اعلیٰ کے درجوں میں آپ ہی کی کوششوں سے منظور ہوئی۔ آپ کے متعدد طالب علم ہند و پاکستان میں اردو ادب کی خدمت سے عظمت حاصل کر رہے ہیں۔

"خدا آپ کو عرصہ دراز تک زندہ اور سلامت رکھے تاکہ جو کچھ آپ اردو کے لیے کرنا چاہتے ہیں وہ بخیر و خوبی انجام پا جائے۔ اردو ادب اور زبان کے حق میں آپ کی ہستی لائق فخر ہے۔"

سنہ ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جس کو آج اٹھارہ سال کا عرصہ ہو رہا ہے لیکن زندگی کی جو روش اُس وقت تھی اس میں آج تک کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ادبی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے ایک بلند مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال دیا۔ خودشناسی، خودداری، پیش بینی، مستقل مزاجی اور استغنا حضرت ادیب کی سیرت کے نمایاں عناصر ہیں۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

مسعود صاحب سے بعض لوگوں کو کم آمیزی کی شکایت ہے، بعضوں کو خطوں کے جواب میں کوتاہی کی شکایت ہے اور بعضوں کو کتابوں کے دکھانے میں بخل کی شکایت ہے۔ ذیل میں ان شکایتوں کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

کم آمیزی: یہ صحیح ہے کہ مسعود صاحب سماجی محفلوں بلکہ ادبی تقریبوں تک میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ اس کا سبب جیسا کہ وہ خود بھی بیان کرتے ہیں یہ ہے کہ وہ اپنے نامکمل تحقیقی کاموں کو مکمل کر لینا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ احساس رہنے لگا ہے کہ اب ان کے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تصنیف و تالیف ان کا واحد نصب العین ہے

اور قلم ہاتھ سے چھوڑ کر زندہ رہنے کو وہ موت کے مرادف سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی سماجی زندگی کو ادبی زندگی پر قربان کر دیا ہے۔ ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے باہر جانے کا کیا ذکر، شہر کے اجتماعوں میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ صرف نہایت ضروری اور اہم امور کے پیشِ نظر گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہیں۔ مسعود صاحب بہت خلیق اور نیک نفس انسان ہیں۔ ان کی کم آمیزی میں خود بینی اور تمکنت کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے، بلکہ وہ عظیم ایرانی شاعر نظیری نیشاپوری کے اس شعر کی مصداق ہے

نہ عیب تست کہ بیگانہ وارمی گزری
کسے کہ زود گسل نیست دیر پیوند است

دسمبر ۱۹۶۶ء کے ایک خط میں وہ خود لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو کسبِ معاش، مستحق اعزّہ کی کفالت، سات بچّوں کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ اور تمام ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے جو وقت صرف کرنا پڑا ہے اُس سے گریز ممکن نہ تھا۔ چھتیس برس کی ملازمت اور فرائض منصبی کی بجا آوری میں کتنا وقت صرف ہو گیا۔ ان ناگزیر مصروفیتوں کے علاوہ سارا وقت ادبی خدمات کی نذر کر دیا۔ ادبی مجلسوں اور شاعروں کی شرکت تک ترک کر دی۔ ایک تارک لذّات خلوت گزیں درویش کی زندگی پر قناعت کی۔"

(مکتوب ادیب)

خطوں کے جواب میں کوتاہی: مسعود صاحب بہت کم خط لکھتے ہیں۔ خطوں کے جواب میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے۔ بعض خطوں کے جواب میں دیر ہوتے ہوتے جواب کا وقت ہی نکل جاتا ہے یا جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سے خط بھیجنے والوں کو شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بچاروں کو ادیب کی معذوریوں اور مجبوریوں کی کیا خبر۔ ہم یہاں ادیب کے ایک خط کا ایک طویل اقتباس پیش کرتے ہیں جو جنوری ۱۹۶۰ء میں ایک باوقار ادبی رسالے کے اڈیٹر کے شکایت نامے کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

"عنایت نامہ مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء وصول ہوا۔ آپ کی سب شکایتیں حق بجانب ہیں۔ آپ کے بھیجے ہوئے خطوط ملتے رہے اور رسائل وصول ہوتے رہے۔ دل شکریے سے لبریز رہا مگر زبان خاموش رہی۔ میں خطوں کے جواب نہ دینے کو بداخلاقی اور رسالے وصول کرکے رسید تک نہ بھیجنے کو ناسپاسی سمجھتا ہوں۔ اور کون چاہے گا کہ جان بوجھ کر بداخلاقی اور احسان فراموشی کا مرتکب بنے۔ مگر حالات کا دباؤ ان فروگذاشتوں کے ارتکاب پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ فرصت کا لفظ میرے لیے "ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا" کا مصداق بن گیا ہے۔ مصروفیت بھی ایسی جس میں مالی منفعت، مادی فوائد یا نام و نمود کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ اپنے ذاتی اور خانگی کام ابتر ہو رہے ہیں اور میں ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنے ادبی منصوبوں پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ کیا کہوں کتنے ادھورے کام ایسے ہیں جن کی تکمیل اپنی زندگی کا مقصد بن گئی ہے۔ عمر کی بہتر منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ آخری منزل اب دور نہیں ہے۔ لیکن بہت سے کام جن پر طویل مدتیں صرف کر چکا ہوں ان میں سے کسی کو بالارادہ ترک کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور سب کاموں کو پورا ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہوں۔ اس عالم میں اکثر ایسے خط آتے رہتے ہیں جن میں کچھ لکھ کر یا کچھ نقل کرکے بھیجنے کی فرمائش ہوتی ہے۔ امکان ہوتا تو کسی فرمائش کو رد نہ کرتا۔ مگر کیا کروں ہر طرح کا ایثار کرکے تنہا کام کرتا ہوں۔ کوئی مالی امداد حاصل نہیں، کوئی ادبی معاون میسّر نہیں۔ میں خود دست نویس ہوں۔ اگر سب خطوں کا جواب لکھتا ہوں اور سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہوں تو تصنیف و تالیف کا کام رہا جاتا ہے۔ انھیں اور ایسے اسباب کا نتیجہ ہے کہ اکثر خطوں کے جواب میں بہت تاخیر ہو جاتی ہے اور بعض خطوں کے جواب رہ جاتے ہیں۔ اس ظاہری بے التفاتی کی بدولت جو وقت ملتا ہے وہ بھی ادب کی خدمت ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اس طرح میرے خیال میں اس فروگذاشت کی گویا تلافی ہو جاتی ہے۔ مگر دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔

اس لیے ان کو بجا طور پر شکایت ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس طویل معذرت کو قبول کر کے میری گزشتہ اور آئندہ فروگذاشتوں کو معاف فرمائیں گے ۔"

کتابیں دکھانے میں بخل: یہ شکایت انھیں کو ہو سکتی ہے جنھوں نے کتابیں دیکھنے کی کبھی خواہش ہی نہیں کی۔ خواہش مندوں کے ساتھ موصوف کا طرزِ عمل ڈاکٹر گیان چند کی زبان سے سنیئے۔ وہ اپنی معرکہ آرا کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' کی اشاعت ثانی میں 'انتساب' کے ذیل میں رقمطراز ہیں:۔

"۱۹۴۵-۴۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں نثری داستانوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ اسی سلسلے میں لکھنؤ جا کر پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے سے استفادے کا ارادہ کیا۔ محبّی سید مسیح الزماں نے کہا کہ میں تعارفی چٹھی لکھ دوں گا۔ میں نے ان کی سفارشی چٹھی لے تو لی لیکن یہ وہم ضرور تھا کہ اتنی اونچی بارگاہ میں مسیح الزماں صاحب کی چٹھی کا کیا اثر ہو گا۔

میں غالباً جنوری ۱۹۴۶ء میں "ادبستانِ مسعود" پر حاضر ہوا۔ بارہ وفات کا دن تھا۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک فرقے پر کرفیو تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے کہ ایک فرقے پر کرفیو لگا دیا جاتا تھا۔ مسعود صاحب کو دن بھر فرصت تھی۔ میں نے چٹھی دی۔ مجھ مجہول الاسم پر انھوں نے اس حد تک کرم کیا کہ اندر کے کمرے سے چند مطبوعہ یا قلمی داستانیں بہ نفسِ نفیس اٹھا کر لاتے تھے۔ میں کچھ دیر میں انھیں دیکھ کر نوٹ لے لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ انھیں لے جاتے تھے اور پھر دوسری جلدیں لاتے تھے۔ دن بھر اسی طرح میری بیگار کی۔ بیچ بیچ میں مفید معلومات سے بھی نوازتے رہے۔ تب سے آج تک میرے حال پر وہی لطفِ خاص ہے۔ یہ اوراق اسی عظیم محقق کے نامِ نامی سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔"

مسعود صاحب کے کتب خانے کے بارے میں علی جواد زیدی کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے: "اس کتب خانے سے طالبانِ علم برابر مستفیض ہوتے ہیں۔ خود مسعود صاحب کا ذوقِ سلیم ان تشنگانِ مطالعہ کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔"

لکھنؤ سے محبت ۔ علی جواد زیدی: "یہ بتادینا ضروری ہے کہ مسعود صاحب لکھنوی نہیں ہیں ۔ اُن کا اصلی وطن ضلع اناؤ کا قصبہ نیوتنی ہے۔ لکھنؤ کے لیے وہ تازہ واردانِ بساط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ کی محبت میں وہ لکھنؤ کے قدیم ترین باشندوں سے بھی آگے ہیں۔ انھیں لکھنؤ کے ذرّے ذرّے محبّت ہے۔ انیسؔ اور واجد علی شاہ تو آپ کی زندگی بھر کی ادبی اور تحقیقی کاوشوں کا مرکز رہے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی پرانے لکھنؤ کا کوئی رطب و یابس ایسا نہیں ہے جس پر مسعود صاحب نے کم از کم ایک بار پیار کی نظر نہ ڈالی ہو۔ لکھنؤ ان پر فدا ہو یا نہ ہو وہ فدائے لکھنؤ ضرور ہیں۔ یہ محبت ادبی زیادہ ہے علاقائی کم"

نورالحسن ہاشمی: "اودھ کی پرانی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اُس کا نمونہ بھی ہوں۔ بادشاہوں میں واجد علی شاہ... اور شاعروں میں انیسؔ آپ کی توجہ کے خاص مرکز ہیں"

میر انیسؔ لکھنؤ کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور واجد علی شاہ اودھ کے آخری رعایا پرور اور ادب نواز بادشاہ تھے جن کو انگریزوں نے بدنام کر کے تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ یہ دونوں مسعود صاحب کی سب سے زیادہ محبوب شخصیتیں ہیں۔ آئیے ان دونوں سے متعلق ادیب کے کارناموں پر ایک نظر ڈالیں۔

یادگارِ انیسؔ ۔ اس عظیم شاعر کی یادگار قائم کرنے کا خیال تو بہتوں کو ہوا ہوگا، لیکن اس تصوّر کو عملی شکل دینے میں اوّلیت کا شرف مسعود صاحب کو حاصل ہوا۔ موصوف نے اپریل ۱۹۶۱ء میں شہر کی نہایت ممتاز اور بارسوخ شخصیتوں کے تعاون سے یادگار انیسؔ کمیٹی کی تشکیل کی، جس کے بلند علمی مقاصد کے علاوہ مکانات انیسؔ کا تحفظ اور مزار انیسؔ کی تعمیر کے عملی مقاصد بھی تھے۔ ان عملی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسعود صاحب کی کارگزاری کا مختصر بیان پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد میر انیسؔ کے مکانات پر کسٹوڈین کا قبضہ ہو گیا

اور ان کی قیمت مقرر کر دی گئی۔ وارثانِ میر انیس میں کوئی ایسا صاحب مقدرت نہ تھا کہ قیمت ادا کر کے مکانات اپنے نام کر والیتا۔ حسبِ قاعدہ مکانات نیلام پر چڑھا دیے گئے۔ بولیاں لگنے لگیں اور دس ہزار تک پہنچ گئیں۔ مسعود صاحب کی دلی خواہش تھی کہ مکانات کی مرمت کر کے ان کو میر انیس کی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا جائے۔ جب ان کو صورتِ حال کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے آخری بولی پر سو روپے کا اضافہ کر کے اپنی جیب خاص سے ان شکستہ مکانات کو خرید لیا۔ اور قواعد نیلام کے مطابق بولی کا دس فیصدی یعنی ایک ہزار دس روپے اسی وقت ادا کر دیے۔

مسعود صاحب اتنے دولت مند نہیں ہیں کہ دس ہزار کی رقم ان کے لیے کوئی چیز نہ ہو۔ خریداری کے بعد مکانات کی بقا کے لیے فوری مرمّت بے حد ضروری تھی، جس کے لیے کم سے کم پچیس ہزار روپے درکار تھے۔ یہ میر انیس کے عشق کا کرشمہ تھا کہ مسعود صاحب کا سا دور اندیش اور عاقبت بیں شخص ایسا اقدام کر گزرا جو اپنی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو کہیے ان کی حیثیت عرفی کے تحفظ کا ایک غیبی ذریعہ نکل آیا یعنی ایک قانونی اعتراض کی بنا پر ان کی بولی نامنظور کر کے نیلام منسوخ کر دیا گیا۔

کچھ زمانے کے بعد مکانات انیس کے دوبارہ نیلام کا اشتہار نکلا۔ اس درمیان میں مسعود صاحب یادگارِ انیس کمیٹی کی تشکیل کر چکے تھے جس کے مقاصد میں مکانات انیس کی خریداری اور مرمّت اور مزار انیس کی تعمیر بھی تھی۔ اب مسعود صاحب نے کمیٹی کے خازن کی حیثیت سے پانچ ہزار کی بولی دی۔ کسی نے بولی بڑھائی نہیں اور نیلام غیر مختتم رہا۔ یہی صورت دو تین مرتبہ اور پیش آئی اور آخر کار ۲۱ مئی ۱۹۶۳ء کو مکانات پانچ ہزار پر یادگار انیس کمیٹی کے نام چھوڑ دیے گئے۔

مکانات کے قریب میر انیس کی بغیا بھی تھی جس میں میر صاحب نے تین دروازوں کا ایک کمرہ بنوا لیا تھا اور اس وقت کی میونسپل کمیٹی سے اپنے خاندان کے اموات کو بغیا میں

دفن کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ انتقال کے بعد میر انیسؔ اسی کمرے کے وسطی دروازے کے مقابل دفن کیے گئے۔ اُن کے بعد اس کمرے کے اندر اور باہر چاروں طرف خاندانِ انیسؔ کے مُردے دفن ہوتے رہے۔ مرنے والوں میں بہت سے شاعر اور مرثیہ گو تھے جن کے تخلّص خاندانی قرابت کے ساتھ مسعود صاحب نے اس اپیل میں درج کر دیے ہیں جو انھوں نے یادگار انیسؔ کمیٹی کے خازن کی حیثیت سے کمیٹی کی جانب سے قدر شناسانِ انیسؔ کے نام شائع کی تھی۔ فرماتے ہیں :-

"مزارِ انیسؔ صرف انیسؔ کی یادگار نہ ہوگا، بلکہ خاندانِ انیسؔ کے ان تمام افراد کی یادگار ہوگا جو اپنی عمریں شاعری اور مرثیہ گوئی میں صرف کر کے اپنے بزرگ خاندان کے پہلو میں محوِ خواب ہیں، یعنی انیسؔ کے ایک بھائی مونسؔ، تین بیٹے نفیسؔ، رئیسؔ، سلیسؔ، تین پوتے عروجؔ، جلیسؔ، قدیمؔ، ایک پرپوتے فائزؔ، ایک نواسے مانوسؔ اور ان کے دو بیٹے واصفؔ اور واثقؔ اور ایک نواسے ذکیؔ، نفیسؔ کے نواسے عارفؔ اور ان کے بیٹے فائقؔ[1]۔ وہ قطعہ آراضی جس پر مزارِ انیسؔ تعمیر کیا جا رہا ہے اس پر یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے ؎

پیچے پیچے یہ ہیں یاں گوہرِ غلطاں تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز"

مکاناتِ انیسؔ کی خریداری سے پہلے مسعود صاحب نے خاندانِ انیسؔ کے ایک لائق فرد اور اپنے شاگردِ رشید سید محمد عباس ایم۔ اے کی وساطت سے تمام وارثان و وارثاتِ میر انیسؔ سے ان کی بنیا کی اراضی کو حسینی دار الآثار اور مقبرۂ میر انیسؔ کی تعمیر

---

[1] اب ان مرحومین میں دو ناموں کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی مانوسؔ کے پوتے سید محمد عباس آصفؔ اور میر سلیسؔ کے پوتے ہاشم حسین حزیںؔ۔

کے لیے وقف کردادیا تھا۔ وقف نامہ ۳ جون ۱۹۶۰ء کو لکھا گیا اور ۱۳ جون کو اس کی رجسٹری کی گئی۔ وقف نامہ مسعود صاحب کے پاس موجود ہے اور راقم اس کو دیکھ چکا ہے۔

اب مکان انیس کی مرمت اور اس آراضی موقوفہ پر مزار انیس کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ سوء اتفاق سے تعمیر کے منصوبے کے بارے میں یادگار انیس کمیٹی کے سکریٹری سید علی عباس حسینی اور خازن سید مسعود حسن رضوی میں کچھ اختلاف ہوگیا۔ جس کا فیصلہ یوں ہوا کہ حسینی صاحب مکان کی مرمّت اور مسعود صاحب مزار کی تعمیر اپنے اپنے طور پر کریں اور ایک کے کام میں دوسرا دخل نہ دے۔ مگر اس چشمک کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسینی صاحب نے استعفا دے دیا اور مکان کی مرمت کا کچھ کام جوائنٹ سکریٹری مرزا رضا حسین صاحب کی نگرانی میں ہوا۔ مزار مسعود صاحب کے بنوائے ہوئے نقشے کے مطابق ماہر تعمیرات خلیل احمد صدیقی صاحب کے فنّی مشورے سے مکمل ہوکر مسعود صاحب کی خوش مذاقی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ مزار انیس میر انیس سے مسعود صاحب کی عقیدت کی ایک پائندہ یادگار ہے۔ اس کی روکار پر انھیں کا کہا ہوا اور ماہر فن خطاط سید ریاض الحسن کا لکھا ہوا یہ شعر سنگِ مرمر کے تختے پر کندہ ہے:۔

جلیست ایں ایوان عالی و نفیس
خواب گاہ شاعر اعظم انیس

میر انیس سے مسعود صاحب کی عقیدت کا دوسرا کارنامہ کلام انیس کی تلاش و تحفظ ہے۔ ان کے عظیم ذخیرۂ مراثی میں میر انیس کا جتنا کلام جمع ہے وہ کسی فرد واحد کا کیا ذکر کسی ادارے کے پاس بھی نہ ہوگا۔

مسعود صاحب کا تیسرا سب سے بڑا کارنامہ ان کی قلمی خدمات ہیں۔ راقم حروف نے میر انیس پر ان کے وہ مضامین دیکھے ہیں جو ۱۹۲۰ء سے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مواد کا وہ انبار بھی دیکھا ہے جو یادداشتوں کی صورت

ہیں موجود اور ترتیب و تنظیم کا منتظر ہے۔ میر انیس پر مسعود صاحب کی کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں یعنی روح انیس، رزم نامہ انیس، شاہکار انیس، اسلاف میر انیس اور ایک رسالہ شاعر اعظم انیس۔ ان مطبوعات کے علاوہ تلخیص انیس کا مسودہ بھی موجود ہے جس میں پچیس بلند پایہ مرثیوں میں سے مکرر اور بھرتی کے بند خارج کر کے گویا ان کا عطر نکال لیا گیا ہے، لیکن کہیں بے ترتیبی یا بے محل اختصار کا عیب پیدا نہیں ہونے پایا ہے۔

پرنانا انیس کے شاگرد رشید

مسعود صاحب کو میر انیس سے جو غیر معمولی عقیدت ہے اس میں ان کے ذوق سلیم کے علاوہ کچھ خاندانی اثر بھی کار فرما معلوم ہوتا ہے۔ ان کے پرنانا میر سلامت علی میر انیس کے شاگرد رشید تھے۔ ان کے فرزند مولوی عبد العلی نے مسعود صاحب کو لڑکپن میں بہت دن پڑھایا تھا اور مرثیہ پڑھنا بھی سکھایا تھا۔ ان دونوں بزرگوں کے میر انیس سے جو عزیزانہ تعلقات تھے ان کا ذکر مسعود صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو آج سے بیالیس برس پیشتر "میر انیس کے کچھ چشم دید حالات" کے عنوان سے ماہنامہ ادب لکھنؤ مورخہ نومبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس مضمون سے مولوی عبد العلی کا بیان نقل کیا جاتا ہے:۔

"میر انیس کے شاگردوں میں آغا میر صاحب سب سے اچھا مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان کے بعد میرے والد کا نمبر تھا۔ میر انیس میرے والد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ میرے یہاں اکثر تشریف لاتے تھے۔ میں بچپن میں ان کے گھر میں جاتا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں میرے سامنے ہوتی تھیں۔ میر صاحب میرے والد کو اپنی پیش خوانی میں پڑھواتے تھے اور ان کے پڑھنے سے خوش ہو کر بیچ کی صحبت میں فرماتے تھے کہ بھیا اب کیا کھاؤ گے۔ میر صاحب کے پاس باہر سے فرمائشیں آتی تھیں کہ اپنے کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کے لیے بھیجیے تو وہ میرے والد کو اپنا شاگرد رشید کہہ کر بھیجتے تھے۔"

"میرے نانا میر اکبر علی میر انیس کے یہاں داروغہ تھے اور میرے ایک مختلف البطن

بھائی راحت علی جو ایک حرم کے بیٹے سے تھے، پہلے میر انیس کے یہاں نوکر تھے، پھر میاں عشق کے یہاں داروغہ ہو گئے تھے اور انھیں کا کلام پڑھنے لگے تھے۔ ان کی یہ حرکت میر صاحب کو بہت ناگوار تھی۔"

"میر انیس کا قد لمبا میانہ سے کچھ زیادہ تھا۔ ان کا بدن چست، ٹھوس اور چھریرا تھا اور رنگ گندمی تھا، میر انیس ہمیشہ کرتا پہنتے تھے۔ پائجامہ عرض کا سفید ہوتا تھا۔ انیس اور مونس ریشمی پائجامے پہنتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر انیس بھی ریشمی پائجامے پہنتے ہوں مگر مجھے سفید ہی یاد ہے۔ زردوزی کام کا گھیتلا جوتا پہنتے تھے۔ داڑھی منڈواتے تھے۔ کچھ کچھ خیال ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ دیانت الدولہ کی کربلا میں میں نے میر صاحب کو انگرکھا پہنے دیکھا تھا۔

"میں نے میر انیس کو دیانت الدولہ کی کربلا میں اور داروغہ محمد خاں کے مکان میں مرثیہ پڑھتے سنا ہے۔ مفتی گنج بہت بڑا اور بہت آباد محلہ تھا۔ اس کے مختلف حصوں کے الگ الگ نام تھے۔ میرا مکان اس حصے میں تھا جو گرمی بیگ خاں کی چھاؤنی کہلاتا تھا اور داروغہ محمد خاں کا مکان اس حصے میں تھا جو مرزا علی خاں کا احاطہ کہلاتا تھا۔ داروغہ محمد خاں کے یہاں کی مجلس میں جب تک میر انیس پڑھتے رہتے تھے داروغہ صاحب منبر کی داہنی طرف کھڑے ہوئے پنکھا جھلا کرتے تھے۔

"وزیر خاں نواب علی نقی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے یہاں کی مجلس مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ وزیر خاں اور داروغہ محمد خاں کے یہاں کی مجلسیں مقابلے کی مجلسیں سمجھی جاتی تھیں انیس اور دبیر دونوں کی شہرت برابر تھی۔ دونوں کے یہاں مجمع برابر ہوتا تھا۔ کوئی دو دو ہزار آدمی ہوتے ہوں گے۔ مکان مجلس کے سامنے فینسوں اور بگھیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔

"مرزا دبیر کی آواز بھدی اور بھاری تھی۔ میر انیس کی آواز سبک اور تیز تھی۔ زیادہ بتاتا کوئی نہ تھا۔ مگر انیس کا ہاتھ نسبتاً زیادہ اٹھتا تھا۔ میں نے نہ خود کبھی دیکھا نہ کبھی کسی سے سنا کہ میر صاحب آئینہ سامنے رکھ کر مرثیے خوانی کی مشق کرتے تھے۔

"میر انیس کے بیٹوں میں میر نفیس کا پڑھنا سب سے اچھا اور باپ کے پڑھنے سے مشابہ تھا۔ سلیس کا پڑھنا باپ سے مشابہ نہ تھا۔ وہ ہاتھ کو بہت حرکت دیتے تھے۔ رئیس کا پڑھنا بالکل معمولی تھا۔

"میر انیس کئی مجلسوں میں پڑھنے کے بعد مرثیہ تقسیم کرتے تھے۔ میر کرم اللہ کو مرثیے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں کھانے کی تنگی ہو تو بھی مرثیہ ضرور خرید لیتے تھے اور معاوضہ دے دے کر نقل کرنے کے لیے مرثیے حاصل کرتے تھے۔

"میر انیس نذرانے کے طور پر کوئی رقم قبول نہ کرتے تھے اور ملازمین کو سخت تاکید تھی کہ جو امرا اور نواب ان سے ملنے آتے تھے ان سے کچھ نہ لیں۔ میر صاحب سیر چشم آدمی تھے مگر خرچ میں ذرا کفایت بھی ملحوظ رکھتے تھے۔"

ادیب اور واجد علی شاہ

میر انیس کی طرح واجد علی شاہ بھی مسعود صاحب کی تحقیق و تلاش کا مرکز رہے ہیں۔ انگریزوں نے ان کو معزول کر کے اودھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی نیت سے ان کے خلاف ایسا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ ان کی ساری خوبیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور ان کا نام عیاشی اور عیش پرستی کا مترادف بن کر رہ گیا۔ ادیب کو اس مظلوم بادشاہ سے ہمدردی ہے اور انھوں نے غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر کے بادشاہ کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ریڈیو پر گفتگوئیں اور علمی مجمعوں میں تقریریں کیں، رسالوں میں مضامین شائع کیے، نذر ذاکر اور نذر مقبول نام کی کتابوں میں طویل مقالے لکھے جن کے عنوان علی الترتیب یہ ہیں: "شاہان اودھ کا ادبی ذوق" "سلطان عالم واجد علی شاہ" "اختر، افسانہ، مصنف شاعر۔ ان مقالوں کے علاوہ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں بادشاہ کی فوجی انتظامی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مستند ماخذوں کی مدد سے نقشہ پیش کیا ہے ان کی زیر طبع کتاب "سلطان عالم واجد علی شاہ" جو انھوں نے اشاعت کے لیے جناب مقبول احمد لاری

واجد علی شاہ کے بارے میں ان کی عمر بھر کی تحقیق کا ماحصل ہے۔ اس کتاب کے ذریعے واجد علی شاہ کی دلکش اور مظلوم شخصیت اپنے اصل رنگ روپ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ کتاب اردو کے تحقیقی کارناموں میں رکھی جائے گی۔

"اردو ادب میں واجد علی شاہ اور ان کے عہد کو بعض اعتبار سے بڑی اہمیت ہے جن پر صحت مند تحقیقی نقطۂ نظر سے کام کیے جانے کی بڑی ضرورت تھی۔ اس ضمن میں اگرچہ کچھ ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ان کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نگارشات کے علاوہ ابھی تک کوئی ایسی کتاب منظر عام پر نہیں آئی جسے مستند تحقیقی ماخذ قرار دیا جا سکے۔"

(سید محمود نقوی۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ادیب اور ادبی تحقیق

ادیب صاحب کی تحقیق خالص یا تحقیق برائے تحقیق نہیں ہوتی۔ صرف حقائق کی دریافت ان کی تحقیق کا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ کسی مخصوص اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس مقصد کے حصول کے لیے تحقیق کرتے ہیں اور تحقیق کے نتیجے میں جو حقائق دریافت ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر اپنے مقصد کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق میں تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ وہ محض خردہ گیری، نکتہ چینی اور رائے زنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اگر دوسروں کی غلطیوں یا غلط بیانیوں کا اظہار ضروری ہوتا ہے تو نرم لہجے میں کرتے ہیں۔ خالص تحقیق کرنے والے منتشر معلومات کا انبار تو لگا دیتے ہیں لیکن اس مواد سے کوئی ادبی تنقیدی یا تاریخی کارنامہ مرتب نہیں کر سکتے۔

پیشتر سے قائم کیے ہوئے کسی خیال یا نظریے کو منوانے کے لیے جو سخن سازی یا قیاس آرائی کی جائے اس کو تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں۔ لسانی، مقامی، قومی، مذہبی غرض کہ کسی طرح کے تعصب، جانبداری یا پرکاشش کو دل میں رکھ کر مفید مطلب

واقعات یا دلائل تلاش کرنا تحقیق کو بدنام کرنا ہے۔

ادبی تحقیق کے بارے میں خود مسعود صاحب کا بیان ملاحظہ ہو... "تحقیق کرنے والوں کے سامنے دو طریق کار ہیں، ایک یہ دوسروں کی غلطیاں نکالی جائیں اور ان کی غلط بیانیوں پر لے دے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اپنی بات ایسی مضبوط دلیلوں کے ساتھ کہی جائے جس سے غلط بیانیوں کی خود بخود تردید ہو جائے۔ دوسرے طریق کار کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرنے والے اہل نظر خال خال ہی ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے میں نے دوسرے ہی طریق کار کو اختیار کیا ہے جس کو تعمیری تحقیق کہنا چاہیے۔ ادبی تحقیق اور ادبی احتساب میں بہت فرق ہے۔ نکتہ چینی، خردہ گیری اور رد و قدح کو کبھی تعمیری تحقیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، لیکن جو لوگ انھیں چیزوں کو تحقیق سمجھتے ہیں ان کو جاں فشانی و مغز کاوی، دیدہ ریزی و نکتہ رسی، تجزیہ و استدلال کے وہ آثار نظر نہیں آتے جو تعمیری تحقیق کے عناصر ترکیبی ہیں۔" (مکتوب ادیب)

"اردو کے موجودہ محققوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے میں ہمارے وہ بزرگ محقق ہیں جو تحقیق کی آبرو ہیں۔ جناب سید مسعود حسن رضوی، مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام ہم سب کے لیے مشعل راہ ہیں۔"

"اگر درس گاہوں کے باہر چند علما... داد تحقیق دے رہے ہیں تو درس گاہوں نے بھی مرحومین میں پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، منشی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری کو اور زندوں میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو وغیرہ کو پیدا کیا ہے۔" (اردو تحقیق پر ایک نظر، از ڈاکٹر گیان چند۔ آج کل جنوری ۱۹۷۳ء)

جی ایم۔ شاہ صاحب کا سوال: "تحقیق و تدوین کے کن اصول کو آپ لازمی قرار دیتے ہیں؟"

جواب: "ادبی تحقیق کرنے والے کو بڑی احتیاط سے کوئی بات کہنا چاہیے۔ اس کے قلم سے نکلی ہوئی ایک غلط بات ہزاروں لاکھوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اس کا سب سے

بڑا اصول سچائی ہونا چاہیے۔ اور سچائی کی تلاش میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔ زود نویسی اور زیادہ نویسی کسی محقق کا طرۂ امتیاز نہیں، بلکہ سب سے بڑا عیب ہے۔"

پروفیسر مختار الدین احمد لکھتے ہیں:

"وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ان کی سب سے پہلی تصنیف ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اس عمر میں بھی جب وہ ۸۰ سے متجاوز ہو چکے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری ہے جس قدر کتابیں اب تک ان کی چھپی ہیں ان سے کہیں زیادہ کتابوں کا مواد ان کے پاس جمع ہے۔ ۔۔ یہ مواد کبھی شائع ہو سکا تو اس کے لیے دس بیس مجلدات بھی کافی نہیں ہوں گے۔ ۔۔۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ وہ بہت قلم روک کر لکھتے ہیں۔ وہ مواد جمع کرنے میں بہت وقت لگاتے ہیں، پھر معلومات کو کاغذ پر منتقل کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ لکھے ہوئے مضمون میں حک و اصلاح کرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھیں تشفی نہیں ہوتی ہے اور کتاب یا مضمون کے لیے مزید معلومات کے حصول میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک مضمون اور ایک ایک کتاب کی تکمیل میں برسوں لگ جاتے ہیں۔"

"۔۔۔ آج بھی صبح منھ اندھیرے سے رات کے گیارہ بجے تک وہ تقریباً سارا وقت پڑھنے لکھنے ہی میں صرف کرتے ہیں۔ مگر اس سارے ایثار و انہماک کے باوجود ان کا نام خادمان اردو کی فہرست میں اکثر نظر نہیں آتا۔۔۔ اگرچہ وہ اس بے التفاتی اور تغافل شعاری کے کچھ عادی سے ہو چکے ہیں لیکن اتنے بے حس بھی نہیں ہوئے کہ ان کے مخلص احباب ان کی جاں فشانی کو نظر انداز کر دیں اور ان پر کچھ اثر ہی نہ ہو۔ قیس عامری کے بارے میں ایک حکایت یہ بھی سنی جاتی ہے کہ نا واقفوں اور بے دردوں کی سنگ زنی کو تو وہ ہمیشہ برداشت کرتا رہا لیکن ایک دفعہ ایک دوست نے ایک کنکری ماردی تو وہ فریاد کرنے لگا۔

"کوئی داستان نویس یا افسانہ نگار ہوتا تو اتنی محنت کے نتیجے میں اپنی تصنیفوں کا ایک انبار لگا دیتا لیکن وہ آہستہ خرام ہیں، اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ کوئی ذمہ دار ادیب اور محتاط محقق

شواہد اور دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ اسے قدم قدم پر ماخذوں کے مطالعے اور حوالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیان میں ایجاز و اختصار، جامعیت و مانعیت، سنجیدگی و متانت، شگفتگی و دل نشینی اور سب سے بڑھ کر اپنے خیالات میں ایسے حسن ترتیب کا خواہش مند ہوتا ہے قدرتاً اس کا قلم صداقت رقم چل ہی نہیں سکتا۔ اس سست نویسی کے باوجود ان کے کام کی ستائش جناب قاضی عبدالودود صاحب کے سے فاضل اور محقق نے بھی کی ہے۔"

(مضمون پروفیسر مسعود حسن رضوی "سہ ماہی تحریر مسعود حسن نمبر")

علی جواد زیدی: "جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہ نمائی کا سوال ہے ہمارے سامنے ہندستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آتے ہیں: قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی۔"

"اگرچہ مرثیوں اور انیس ہی کو ان کی اہم تر تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے تھا، لیکن ابھی تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں "اردو ڈراما اور اسٹیج" ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے اور بہت سا نیا مواد پیش کیا ہے اس کتاب پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے انعام بھی ملا ہے۔"

"مسعود صاحب ہمارے ان محققین میں ہیں جن کا اثر ان کی زندگی ہی میں محسوس کیا جانے لگا ہے۔" (تحقیق نمبر)

ڈاکٹر گیان چند: (اردو نمبر سے) "تحقیق کے میدان میں ایک طرف سید مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی اور مالک رام جیسے پختہ کار اساتذہ ہیں تو دوسری طرف وہ ناتجربہ کار نوجوان ہیں جو ایم۔ اے کر کے نکلے ہیں اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے لکھ رہے ہیں ان دو انتہاؤں کے بیچ میں ہر معیار کی تحقیق ملتی ہے۔ بالکل ابتدائی ڈرامے پر اردو کے بزرگ محقق سید مسعود حسن رضوی کی کتاب "اردو ڈراما اور اسٹیج" تحقیق کا شاہکار ہے۔ اردو میں اس معیار کی تحقیق کم ہوئی ہے۔" "سید مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں واجد علی شاہ پر اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، میں امانت پر عالمانہ تحقیق کی ہے۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی: مسعود صاحب اس دور کے ایک عظیم محقق اور نقاد ہیں۔ دور

حاضر میں ہندوستان اور پاکستان میں ان کی ٹکر کا کوئی محقق نہیں ہے۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ، چوتھا ایڈیشن)

پروفیسر فضیح احمد صدیقی: "ناٹک ساگر کی پیدا کی ہوئی غلط فہمی ایک ایسی واہیات روایت بن گئی ہے جسے گزشتہ پچاس برسوں سے خواہ مخواہ تسلیم کیا جا رہا ہے اور جس نے پنڈت کیفی، امتیاز علی تاج، مجنوں گورکھپوری، خادم محی الدین، انجم اعظمی اور پروفیسر محمد اسلم قریشی تک کو اپنے دام میں الجھا رکھا ہے۔ صرف ایک محقق اور نقاد ایسا ہے جو ان غلط بیانیوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا، اور وہ ہیں جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب۔" (اردو کا پہلا ایک بابی ڈراما[6])

شمیم کرہانی: اپنے مضمون "غالب نمبر پر ایک رائے" میں لکھتے ہیں: "پروفیسر مسعود حسن ادیب کی تحقیقی تلاش تخلیقی مواد کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔" (ماہنامہ آج کل، دہلی، مئی ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر شارب ردولوی: "اردو تحقیق کی دنیا میں سب سے زیادہ محتاط محقق قاضی عبدالودود ہیں۔ ان کی تحقیق کو خالص تحقیق کا نام دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ تحقیق و تنقید کو الگ الگ رکھتے ہیں ...... وہ حالات و واقعات کی جستجو، مصنف و شاعر، اس کے عزیز و احباب یہاں تک کہ دیوان کے کاتب اور اس کے رشتہ داروں کی تلاش اور صحت و موازنۂ متن اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے مضامین اور کتابیں اغلاط، تضاد، اختلاف متن و سنین کا کیٹلاگ ہو کر رہ جاتی ہیں ... دیوان جوشش، رسالہ معیار، عیارستان، تذکرۂ ابن طوفان اور بہت سے مضامین ان کا تحقیقی کارنامہ ہیں ... تحقیقی ذمہ داری کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی زندگی اردو ادب کی تحقیق کے لیے وقف کر دی ہے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں ہماری شاعری، روح انیس، اردو ڈراما اور اسٹیج، رزم نامۂ انیس، دیوان فائز ... وغیرہ بہت اہم ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق کے ساتھ تنقید کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں اور کسی فن پارے کو تحقیق کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اور اس خاص عہد میں اس کے مقام کا تعین بھی کرتے ہیں۔ تنقید، تحقیق

کا یہ توازن بہت کم محققین کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے مضامین سلجھی ہوئی اور واضح تحقیق کی بہترین مثال ہے۔" (جدید اردو تنقید، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۲۸-۴۳۰)

نسیم قریشی: "مسعود صاحب تحقیق کا بہت شائستہ اور اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں بڑے گراں قدر ادبی نوادر موجود ہیں۔ فائز دہلوی کے دیوان کو مرتب کر کے انھوں نے شمالی ہند میں اردو ادب کے آغاز پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے۔ (اردو ادب کی تاریخ)

پروفیسر سید احتشام حسین: تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے سادہ اور دلکش انداز میں اردو شاعری کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے اور کئی کتابیں بڑی تحقیق کے بعد چھپوائی ہیں (اردو کی کہانی ۱۹۵۶ء صفحہ ۹۲)

وسیع النظر نقاد مظفر علی سید نے "اردو ادب اور تحقیق" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالے میں ممتاز ادبی محققوں[1] کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے تحقیقی مزاج اور انداز تحقیق کا سراغ لگایا ہے اس مقالے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں... انھوں نے علمی تحقیق کے جدید اصولوں کی تربیت کسی غیر ملکی یونیورسٹی میں نہیں پائی۔ مگر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ وہ ان اصولوں سے ناواقف نہیں ہیں۔ ان کے یہاں خردہ گیری اور تفصیل پرستی کے رجحانات بھی نہیں ملتے بلکہ وہ توڑ و فدرح کے کام سے کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے جب اندرسبھا کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ دربار اودھ سے اس کا کچھ تعلق تھا یا نہیں تو انھوں نے چپکے سے امانت کی لکھی ہوئی ایک ایسی نثری تحریر پیش کر دی جس سے سارا قضیہ از خود صاف ہو گیا۔ یہی مزاج اور دستاویزی انداز ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے... حال ہی میں ان کی دو کتابیں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج شائع ہوئی ہیں جن سے اردو ڈرامے کے آغاز پر پہلی بار صحیح روشنی پڑی ہے۔ ان کے تحقیقی مزاج کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی تصنیف آب حیات کا تنقیدی مطالعہ پیش کی جا سکتی ہے۔" (رسالہ نقوش لاہور اگست ۱۹۶۰ء)

---

[1] حافظ محمود شیرانی، عبد الحق، مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبد الودود، سید عبد اللہ۔

مقالے میں ممتاز ادبی محققوں[1] کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے تحقیقی مزاج اور اندازِ تحقیق کا سراغ لگایا ہے۔ اس مقالے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں۔۔۔ انھوں نے علمی تحقیق کے جدید اصولوں کی تربیت کسی غیر ملکی یونیورسٹی میں نہیں پائی، مگر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ وہ ان اصولوں سے ناواقف نہیں ہیں۔ ان کے یہاں خردہ گیری اور تفصیل پرستی کے سے رجحانات بھی نہیں ملتے۔ بلکہ وہ توڑ پھوڑ قدح کے کام سے کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے جب اندر سبھا کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ دربار اودھ سے اس کا کچھ تعلق تھا یا نہیں تو انھوں نے چپکے سے امانت کی لکھی ہوئی ایک ایسی نثری تحریر پیش کر دی جس سے سارا قضیہ از خود صاف ہوگیا۔ یہی مزاج اور دستاویزی انداز ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔۔۔ فارسی مرثیے پر ان کا مضمون، رباعیاتِ[2] انیس اور روحِ انیس کے دیباچے[3] اور ان کی مرتبہ کتابوں میں فیض میر، مجالس رنگین، دیوان فائز اور متفرقات غالب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں ان کی دو کتابیں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج شائع ہوئی ہیں۔ جن سے اردو ڈرامے کے آغاز پر پہلی بار صحیح روشنی پڑی ہے۔ ان کے تحقیقی مزاج کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی تصنیف "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" پیش کی جا سکتی ہے۔

(رسالہ نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۰ء)

لفظ و معنی کی تحقیق۔ ڈاکٹر گیان چند:۔ "تحقیق کے سلسلے میں لفظ و معنی کی تحقیق کو نظر انداز

---

[1] محمود شیرانی، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، سید عبداللہ۔

[2] 'شاہکار' کی جگہ 'رباعیات' سہو قلم معلوم ہوتا ہے۔

[3] دیباچے نہیں مفصل اور مطول مقدمے۔

نہیں کیا جا سکتا نعت نگاری یہی کرتی ہے۔ مخصوص لغات میں سید مسعود حسن رضوی کی فرہنگ۔ امثال اور مولانا امتیاز علی عرشی کی فرہنگ غالب قابل ذکر ہیں۔

(اردو نمبر)

لفظ و معنی کی تحقیق میں مسعود صاحب نے جو کاوش کی ہے وہ ان کی مندرجہ ذیل تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ رسالہ الناظر لکھنؤ بابتہ مئی ۱۹۲۳ء میں مضمون "اردو زبان میں فارسی ترکیبیں" رسالہ تحریر دہلی جلد ۵ شمارہ ۲ میں مراثی، ریختہ کی زبان کی خصوصیات دیوان فائز میں فٹ نوٹ اور فرہنگ۔ فیض میر طبع دوم میں فرہنگ۔ روح انیس میں فٹ نوٹ۔ اندر سبھا مرتبہ ادیب میں اندر سبھا کی زبان اور اندر سبھا کے گیتوں کی زبان۔

ترتیب متن۔ ڈاکٹر گیان چند:۔ تحقیق میں بنیادی کام متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اگر اردو کے بڑے ادیبوں کی تصانیف میل اور کھوٹ سے پاک ہو کر سامنے آجائیں تو مطالعۂ ادب کے رستے میں لغزش کا امکان کم ہو جائے گا۔

منظومات کی ترتیب میں دیوان غالب کا نسخۂ عرشی سر فہرست ہے۔۔۔ ترتیب متن کی دوسری اچھی مثالیں سید مسعود حسن رضوی کا دیوان فائز اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی بکٹ کہانی۔

سید مسعود حسن رضوی کی کتاب "اردو ڈراما اور اسٹیج" کی جلد اول کا موضوع واجد علی شاہ اور جلد دوم کا امانت اور اس کی اندر سبھا ہے۔ جلد دوم میں اندر سبھا کے متن کی ترتیب اس نوع کے بہترین کاموں میں شمار کی جائے گی۔

(اردو نمبر)

اردو میں ترتیب متن کا کام بڑا اہم لیکن بڑا مشکل ہے۔ اس قسم کے زیادہ بہتر کام وہ ہیں جو ڈگری کے لیے نہیں کیے گئے مثلاً۔۔۔ دیوان فائز اور اندر سبھا وغیرہ (تحقیق نمبر)

علی جواد زیدی: اچھے اور صحیح متون کی طباعت کے لیے اہم اقدامات کیے گئے ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی کا دیوان فائز، قاضی عبدالودود کا دیوان جوشش اور دیوان رضا..... اچھے متون کے نمونے ہیں۔ (تحقیق نمبر)

قاضی عبدالودود: فاضل مرتب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قسم کی کتابوں میں جو انجمن نے شائع کی ہیں بہت کم ملتا ہے۔ ترتیب کا یہ طرز معیار، قابل تقلید ہے۔

(معاصر حصہ ۱ ص۱۸)

ادیب، مرثیہ اور انیس

علی جواد زیدی (تحقیق نمبر ۳)

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ساری زندگی ہی مرثیوں کی تحقیق و تلاش میں صرف کر دی۔ کئی ایک کتابیں بھی چھپ گئی ہیں۔ ان میں سفارش حسین کی "اردو مرثیہ" کا پھیلاؤ تو کافی ہے لیکن انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ بوجھ اٹھا لیا۔ کتاب کی تحقیقی حیثیت بے حد مجروح ہے... اردو مرثیے کے پانچ سو سال" جیسے بلند آہنگ نام سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کو تحقیق کا نام دینا مشکل ہے[1]۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے خاندان انیس کے ابتدائی مرثیہ گویوں کے حالات

---

[1] زیدی صاحب نے اپنی بے لاگ تنقیدی روش سے ہٹ کر بڑی رعایت سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کا جو نسخہ مسعود صاحب کے کتب خانے میں ہے اس کے سرورق پر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے "غلطیوں، غلط بیانیوں، بے ربطیوں، بے ترتیبیوں، نافہمیوں، ناواقفیتوں اور بے جا جسارتوں کا شاہکار۔ پاکستان کے معیار تحقیق کی طرف سے بدظنی تو تھی ہی، اس لیے امید نہیں تھی کہ یہ کتاب کوئی قابل قدر تصنیف ہوگی۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ اتنی گراوٹ کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

بڑی کاوش و تحقیق سے جمع کیے ہیں۔ اس سلسلے کے کچھ مضامین شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اب کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

مرثیہ نگاروں میں سب سے زیادہ کام میر انیس پر ہوا ہے "موازنہ" کے بعد امیر احمد علوی، امجد علی اشہری، سید مسعود حسن رضوی ادیب نے بھرپور کام کیا ہے۔ لیکن رزم نامہ انیس یا روح انیس سے پروفیسر رضوی کے کام کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے انیس پر بہت سا ذخیرہ معلومات یکجا کر لیا ہے اور ان کی تفصیلی کتاب جلد ہی سامنے آنے والی ہے۔

انیس پر کئی بزرگ کام کر رہے ہیں جن میں سرفہرست سید مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔ مرثیوں کا انھوں نے نادر اور بہت ہی وسیع ذخیرہ یکجا کر لیا۔ اور اب یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مرثیوں کا جتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس ہے کہیں اور نہیں ہے۔ مسعود صاحب کی مراثی سے دلچسپی متعدی ثابت ہوئی اور پچھلی دہائیوں میں بہت سے صاحبان علم مراثی اور مرثیہ نگاروں پر داد تحقیق دے رہے ہیں۔

انیس کے بارے میں ابھی تک "روح انیس اور رزم نامہ انیس" نامی دو کتابیں اور متفرق مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ادھر بندگان انیس پر ایک سلسلۂ مضامین دیکھنے میں آیا۔ فارسی مراثی کی تاریخ مرتب ہے لیکن ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ قدیم مرثیہ نگاروں کے مراثی بھی اپنے تفصیلی حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مرثیے پر ان کی نظر وسیع اور گہری ہے اور اتنا مواد یکجا کر لیا ہے کہ اس سب کو سمیٹنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ فارسی مرثیہ پر ان کی کتاب مکمل ہے۔ اردو مرثیے کو تحقیق کا موضوع تو یہ معرکہ آرا انھوں نے ہی بنایا ہے اور اب تک وہ اس کا صرف ایک حصہ جو انیس اور خاندان انیس سے متعلق ہے گرفت میں لا سکے ہیں۔ بقیہ حصوں پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی ہے لیکن مختلف مضامین ضرور لکھے ہیں۔

ملا جواد زیدی:۔ دنیا کے سب سے بڑے مرثیہ نگار انیس کے حالات زندگی اور کلام کا تو کوئی پہلو ایسا نہ ہوگا جو آپ کی نظرِ تحقیق سے بچ رہا ہو..... انیس نے اردو کو تابِ گویائی بخشی۔ اس نے ہمیں چکبست کی قومی شاعری عطا کی اور لکھنؤ کے انحطاط کو نشاۃ ثانیہ سے بدل دیا۔ اس ادبی دین کو مسعود صاحب نے عوام و خواص تک پہنچانے میں بڑا کام کیا ہے اور کرتے جا رہے ہیں۔

تحقیق بڑا ہی جانگداز کام ہے۔ تاریخ کے اندھیروں کو دماغ و جگر کا خون جلا کے روشن کرنا پڑتا ہے۔ اس جگرکاوی اور دماغ سوزی کو کوئی بھی تفریحاً اختیار نہیں کرتا۔ مرثیہ کی تحقیق اس لیے بھی مشکل تھی کہ پہلے اس طرف بالکل ہی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ مسعود صاحب کے ایامِ شباب میں لکھنؤ میں مرثیہ ایک زندہ صنفِ سخن تھا۔ جس ماحول میں مسعود صاحب رہتے تھے، وہ مرثیہ گویوں سے بہت قریب تھا۔ پھر اس صنفِ سخن کو زوال شروع ہوا اور اب تو اسے ختم ہی سمجھیے۔ لیکن مسعود صاحب کے ذوقِ تجسس پر اس گرم و سرد زمانہ کا بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ انھوں نے مرثیے کے نایاب ذخیروں کو دستبردِ زمانہ سے محفوظ کر کے اپنے قیمتی کتب خانے میں یکجا کر لیا ہے اور اب وہ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"

(آپ سے ملیے)

"مسعود صاحب خود نہ تو مرثیہ گو ہیں نہ مرثیہ خوان لیکن مرثیے کی تاریخ و تفسیر و تنقید پر آپ کی تحقیق حرفِ آخر کا مرتبہ رکھتی ہے۔"

(آپ سے ملیے)

ڈاکٹر گیان چند:۔ "مرثیے پر پروفیسر مسعود حسن رضوی کے تاریخ ساز کام کی تکمیل کا ابھی انتظار ہے۔"

(تحقیق نمبر)

مسعود صاحب کی کتاب 'اسلافِ میر انیس' حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ میر انیس پر اپنے دو درجن مطبوعہ مضامین کا مجموعہ بھی جلد شائع کریں گے۔

ادیب **بحیثیت نقاد**۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو تنقید کے دورِ سوم کے بارے میں

لکھتے ہیں: "یہ لوگ نقاد کے ساتھ ساتھ محقق بھی ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید اور تحقیق شانہ بشانہ چلتی ہے۔ ان نقادوں کی وجہ سے تنقید اور تحقیق دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایک اعلیٰ محقق اور ایک نکتہ رس نقاد ہیں۔ فیض میر، مجالس رنگین، جواہر سخن جلد دوم، کلیاتِ فائز اور اندر سبھا وغیرہ ان کی تحقیقی کاوشات ہیں، جو ان کے شعور اور سلیقے پر دال ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک ذہین نقاد ہیں۔ ان کا تنقیدی کارنامہ ہماری شاعری ہے جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی طرح حیات جاوید حاصل کر چکا ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نظری تنقید کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس نکتے کو پیش کرتے ہیں اس کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں تحریر فرماتے ہیں۔ اس طرح ان کا کوئی خیال مبہم نہیں رہتا ہے بلکہ ہر خیال آرسی اور آئینے سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ یہ خوبی اس دور کے نقادوں کے یہاں عام طور پر نہیں پائی جاتی ہے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ہماری شاعری میں بہت سنجیدہ مسائل سے بحث کی ہے۔ اس سے ان کے تنقیدی شعور پر روشنی پڑتی ہے۔ روح انیس اور شاہکار انیس سے بھی ان کی تنقیدی قوت معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک مشرقی انداز کی تنقید کا تعلق ہے، ان کے مقابل کا نہ کوئی نقاد ہندوستان میں ہے اور نہ پاکستان میں۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ، چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۲ء)

علی جواد زیدی: "مسعود صاحب ادب کی دنیا میں محقق نہیں بلکہ ایک ناقد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ ان کی کتاب ہماری شاعری حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے سلسلے کی چیز ہے۔ اس کی زبان، سنجیدہ گفتاری اور مدلل طرز بیان کو وہ قبول عام ملا کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مسعود صاحب کی تحقیق میں تفصیل، وسعت اور

ہے اور وہ تحقیق کے ساتھ ہی قدیم طرز کے اصلاحی نقد ادب میں بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(تحقیق منبر)

ڈاکٹر گیان چند :- "آزاد پر سید مسعود حسن رضوی کا آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ خاصے کی چیز ہے۔"

(اردو منبر)

حالیؔ اور ادیبؔ - حالیؔ کی 'شعر و شاعری' اور ادیبؔ کی 'ہماری شاعری' پر ایک تقابلی نظر۔

پروفیسر سید اعجاز حسین :- "آپ کی کتاب 'ہماری شاعری' اردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ 'ہماری شاعری' کا وجود بہت بروقت ہوا۔"

(مختصر تاریخ ادب اردو بار دوم صفحہ ۴۲۶)

علامہ سید سلیمان ندوی :- "یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اردو شاعری کی تنقید و تبصرہ پر مقدمۂ حالیؔ کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسری تصنیف ہے۔"

(معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۲۹ء)

مولانا عبدالماجد دریا بادی 'ہماری شاعری' پر تبصرہ کرتے ہوئے مقدمۂ حالیؔ سے اس کا تقابل یوں کرتے ہیں۔

" اصلی اور بڑا فرق دونوں کتابوں میں نقطۂ نظر کے اختلاف کا ہے۔ مولانا حالیؔ کا نقطۂ نظر تمام تر اخلاقی تھا۔ انھوں نے اردو شاعری پر ایک واعظ و مصلح کی حیثیت سے نظر کی تھی، اور اس لیے وہ بہت لکھا جو اس حیثیت سے انھیں لکھنا چاہیے تھا اور اردو شاعری پر وہ اعتراضات کیے جو تقریباً ہر شاعری پر وارد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے مصنف ادیبؔ کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف تمام تر ادبی ہے۔ انھوں نے شاعری کے ان معیاروں کو تسلیم کرکے جو سارے عالم کی شاعری میں مسلّم ہو چکا ہے اردو شاعری کو اس پر جانچا اور بالکل کھرا پایا۔"

مولانا حالی کے مقدمہ اور ان کی کتاب میں (بہ زبان حضرت اکبر) وہی فرق ہے جو چینی کے پیالے اور شراب کے گلاس میں ہو سکتا ہے۔"

(روزنامہ ہمدرد، دہلی، ۲۰ جون ۱۹۳۸ء)

حامد اللہ افسر میرٹھی:۔ "خواجہ حالی کے مقدمے کے بعد اس موضوع پر جس قدر کتابیں شائع ہوئیں 'ہماری شاعری' ان سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے اور ... ہر حیثیت سے مقدمۂ شعر و شاعری کے ہم پلّہ ہے۔"

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی:۔ "حالی کی شعر و شاعری کے روشن چراغ کے نیچے جو ہلکا سا اندھیرا لازماً رہ گیا تھا، اسے 'ہماری شاعری' نے دور کر کے اردو ادب کی بزم کو ہر طرف سے منور کر دیا ہے۔ اگر مولانا حالی اس وقت زندہ ہوتے تو آپ کی اس کوشش کی یقیناً داد دیتے۔"

مرزا محمد عسکری:۔ "مجھ کو یہ کتاب خواجہ حالی کی شعر و شاعری سے زیادہ پسند ہے۔ میرے دل پر تو اس کتاب نے ایسا اثر کیا کہ اگر بالفرض میں جوان اور زمانۂ حال کے فرقۂ متشککین میں سے ہوتا تو یقیناً آمنت بھذا الکتاب کہہ کر اپنا مسلک بدل دیتا۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی:۔ "ان کا تنقیدی کارنامہ ہماری ... ہے جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی طرح حیاتِ جاوید حاصل کر چکا ہے۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ)

ڈاکٹر انصار اللہ:۔ "میرے والد محترم فرماتے تھے کہ حالی کے بعد بلکہ ان کا جواب اگر کوئی سخن شناس نقادِ سخن پیدا ہوا تو وہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ہی ہیں۔"

(خط بنام صفدر آہ مورخہ ۸ مئی ۱۹۷۳ء)

مصنفِ 'ہماری شاعری':۔ "خواجہ حالی نے اپنے دیوان کا جو معرکہ آرا مقدمہ شعر و شاعری کے عنوان سے لکھا۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کے نقائص دکھائے

جائیں اور ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں۔ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے اردو شاعری کے اس حصے کو نمایاں کیا ہے جو ان کی رائے میں اصلاح کا محتاج تھا اور اس حصے سے عمداً چشم پوشی کی ہے جو ان کے نزدیک بھی اصلاح سے مستغنی اور تعریف کا مستحق تھا، کیونکہ وہ ان کے موضوع بحث سے خارج تھا۔

'ہماری شاعری' خواجہ حالی کی شعر و شاعری کا جواب نہیں، اس کا تتمہ ہے حالی نے تصویر کا ایک رخ دکھایا ہے، اس کتاب میں اس کا دوسرا رخ پیش کیا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کتابوں کا غور سے مطالعہ کریں گے وہ اردو شاعری کے دونوں رُخ دیکھ کر صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔" (ہماری شاعری)

خواجہ حالی جلیل عالم اور عظیم شاعر تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ملکی تاریخ اور ادبی تحقیق میں زیادہ دخل نہیں تھا۔ انھوں نے یادگارِ غالب میں غالب کی ایک مثنوی اور اس کے سبب تصنیف کا بیان تفصیل سے کیا ہے اور اس بیان میں مرزا حیدر شکوہ کو اکبر شاہ کا بھتیجا اور مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً دمغ الباطل رکھا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔

مسعود صاحب کہتے ہیں کہ "خواجہ حالی کے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں، جن میں دو بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر شاہ کا بھتیجا بتایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ان کے بیٹے مرزا کام بخش کے بیٹے تھے۔ یعنی مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے، اور اکبر شاہ مرزا سلیمان شکوہ کے بڑے بھائی تھے۔ اس لیے مرزا حیدر شکوہ اکبر شاہ کے بھتیجے نہیں بلکہ پوتے ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ کے بیٹے تھے، اس لیے وہ مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوئے۔ مرزا حیدر شکوہ اپنی مثنوی

شوکت حیدری میں خود لکھتے ہیں :۔

جناب بہادر شہ نام دار — کہ ہم عم ماہست وہم شہریار

دوسری غلطی یہ ہے کہ درنج الباطل مرزا غالب کی مثنوی کا نام نہیں ہے بلکہ شیخ امام بخش صہبائی کی مثنوی کا نام تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے ۔ غالب کی زیر بحث مثنوی کا غالباً کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔"

مرزا غالب اور ادیب

ڈاکٹر گیان چند :۔ "غالب پر آج کل خصوصی توجہ کی جا رہی ہے ۔ ان کی متفرق چیزیں تلاش کر کے قاضی عبدالودود نے 'آثر غالب' میں سید مسعود حسن رضوی نے 'متفرقات غالب' میں اور ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کی نادر تحریریں پیش کیں ۔" (اردو ممبر)

مسعود صاحب نے مرزا غالب کے غیر مطبوعہ اور نادر مکتوبات و منظومات کا مجموعہ متفرقات غالب کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۹ء میں شائع کیا ۔ ان کا ایک مضمون "مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شان نزول" رسالہ الناظر، لکھنؤ بابت دسمبر ۱۹۳۲ء میں اور ایک مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی" رسالہ زمانہ کانپور بابت مارچ و اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکا تھا ۔ اس دوسرے مضمون کا حوالہ غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں کئی جگہ دیا ہے ۔ مسعود صاحب نے "مرزا غالب، تب اور اب" کے موضوع پر ریڈیو پر گفتگو کی جو ان کی کتاب نگارشات ادیب میں شامل ہے ۔

غالب کے ایک شعر کی شرح ماہنامہ کتاب، لکھنؤ مورخہ مارچ ۱۹۶۹ء میں "فکر غالب" کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ شعر یہ ہے:

لے متفرقات غالب، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ

تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

مسعود صاحب کا مضمون "غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ" ہماری زبان علی گڑھ مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ ان کی کتاب "شرح طباطبائی اور تنقید کلامِ غالب" ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

ادبی مشاغل اور طریقِ کار۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے سوالات: آج کل آپ کس موضوع پر کام کر رہے ہیں؟

جواب۔ کئی کتابوں کی تکمیل مدِ نظر ہے، جن کے موضوع یہ ہیں۔ فارسی مرثیے کی تاریخ، ایرانیوں کا مذہبی ڈراما، اردو مرثیے کی تاریخ، میر انیس کی زندگی اور شاعری، شاہانِ اودھ کے علمی اور ادبی کارنامے، واجد علی شاہ کی نجی زندگی اور علمی مشاغل۔

سوال۔ کیا آپ اتنے مختلف موضوعوں پر ایک ساتھ کام کر رہے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں۔ تیس چالیس برس سے یہ سب موضوع میرے پیشِ نظر ہیں اور ان کے لیے ماخذوں کی تلاش اور مواد کی فراہمی کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر موضوع پر یادداشتوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اب ان یادداشتوں کو ترتیب دینا ہے اور جو کھانچے باقی رہ گئے ہیں ان کو پُر کرنا ہے۔ ان کاموں کے لیے بھی برسوں کا وقت درکار ہے۔

سوال۔ کیا آپ نے اپنے کل ادبی کاموں کی اسکیم بہت پہلے سے بنالی تھی؟

جواب۔ کل کاموں کی تو نہیں لیکن اب سے چالیس برس پیشتر سے لے کر تیس برس تک تقریباً دس سال کے اندر میرے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ سب کام ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان میں سے ہماری شاعری، فائز دہلوی، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ تحقیقی کام ہیں جو اشاعت کی منزل سے گزر چکے ہیں۔ باقی کام حسبِ معمول جاری ہیں۔

تحقیقی کاموں کے بیچ بیچ میں کتابوں کو ترتیب دینے یعنی اڈٹ کرنے کا کام بھی ہوتا رہا، جس کے نتیجے میں فیضِ میر، مجالسِ رنگین، جواہرِ سخن، روحِ انیس، شاہکارِ انیس، متفرقاتِ غالب، تذکرۂ نادر اور فسانۂ عبرت شائع ہو چکی ہیں۔

تحقیق و ترتیب کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کچھ اور کام بھی ہوتا رہا، جس کا ظہور دبستانِ اردو، فرہنگِ امثال، اردو زبان اور اس کا رسم خط، آئینۂ سخن فہمی، نظامِ اردو اور رزم نامۂ انیس کی صورت میں ہوا۔

تصنیفات و تالیفات

علی جواد زیدی: "آپ کی تصانیف کی فہرست طویل ہے، تالیفیں بھی متعدد ہیں۔ کتابوں میں ہماری شاعری اور روحِ انیس بے حد مقبول ہیں۔ امتحانِ وفا، فیضِ میر، مجالسِ رنگین، شاہکارِ انیس، شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر، متفرقاتِ غالب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اندر سبھا[1] امانت اور بزمِ سلیمان[2] نامی قدیم اردو ڈراموں کی تازہ اشاعت بڑی تحقیق و کاوش سے کر رہے ہیں اور سیر حاصل مقدمے بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو مرثیوں کی تاریخ، اردو ڈرامے کا پہلا دور، انیس کے حالات اور کلام پر تبصرے زیرِ ترتیب ہیں۔ واجد علی شاہ اور ان کے ادبی کارناموں پر بھی کافی لکھ چکے ہیں۔ ریڈیو کی تقریروں اور رسائل میں شائع شدہ متفرق مضامین میں بھی شانِ تحقیق باقی رکھی ہے اور امید ہے کہ وہ اُن کا بھی ایک مجموعہ ضرور شائع کرائیں گے"[3]۔ (آپ سے ملیے)

---

[1] اندر سبھا کو ادارہ کتاب نگر، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

[2] ناٹک بزمِ سلیمان رسالۂ نقوش، لاہور مورخہ اگست ۱۹۶۹ء میں شائع ہو گیا ہے۔

[3] ادیب کے اٹھارہ تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ نگارشاتِ ادیب کے نام سے کتاب نگر، لکھنؤ نے شائع کیا۔

"تذکروں میں گلشن سخن اور تذکرۂ نادر کی اشاعت بھی انھیں کی مرہون منت ہے۔ ان دونوں پر انھوں نے مختصر مقدمے لکھے ہیں۔ لیکن بہت سی مفید باتوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ فسانۂ عبرت، فیض میر، اور مجالس رنگین کی طباعت سے بھی انھوں نے ان پرانے شہ پاروں کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے اور ان کی بہت سی خصوصیتوں کو اجاگر کیا ہے۔"

(تحقیق نمبر)

"تاریخ اودھ سے متعلق بعض چیزیں انھوں نے پیش کی ہیں۔"

(تحقیق نمبر)

علی عباس حسینی :۔ "علاوہ تصنیفات و تالیفات کے ان کا غیر مطبوعہ کام بہت ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں ان کے لیے کلکتہ، پٹنہ، حیدر آباد اور علی گڑھ کے سفر کا بہانہ بن جاتی ہیں۔ جب تک کہ وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے کو مطمئن نہ کر لیں گے مضمون نامکمل رہے گا۔ سیکڑوں تحقیقی کام محض اس لیے زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے کہ ان میں کوئی بنی مشکوک سی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر وہ چیزیں بھی طبع ہو گئیں جو اب تک مسودے کی صورت میں پڑی ہیں تو میری طرح آپ کو بھی ماننا پڑے گا کہ مسعود صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو ادبی دیو کہا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر گیان چند :۔ "مسعود حسن رضوی نے سرور کا فسانۂ عبرت، مبتلا لکھنوی کا تذکرہ 'گلشن سخن' اور کلب حسین خاں نادر کا تذکرۂ نادر شائع کیے ہیں۔"

(اردو نمبر)

صباح الدین عبد الرحمٰن :۔ "کمیاب دواوین کی اشاعت کے سلسلے میں انجمن [ترقی اردو] نے نواب صدر الدین فائز کا دیوان بھی پروفیسر مسعود حسن رضوی کے محققانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے بڑی محنت سے فائز کی دوسری تصانیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔"

خود مسعود صاحب کا بیان "میری ادبی خدمتوں کی عمر اب نصف صدی کے قریب ہے۔ میری کتاب امتحان وفا جو لارڈ ٹینی سن کے ایک منظوم قصے کا ترجمہ ہے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ میرا مضمون 'دی کلچرل ویلیو آف اردو' مئی ۱۹۲۳ء میں اور مبسوط مقالہ "شعر" فروری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تقریباً دو درجن کتابیں اور بارہ درجن مضمون اور مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ اور کئی اہم تحقیقی کام اشاعت کے منتظر ہیں۔ کوئی کتاب ایسے موضوع پر نہیں لکھی جو دوسرے لکھنے والوں کا تختۂ مشق رہ چکا ہو اور شاید کوئی مضمون اور مقالہ ایسا نہیں لکھا جس سے موجودہ ذخیرۂ معلومات میں کچھ اضافہ نہ ہوا ہو.... میں بہت سست نویس ہوں۔ کوئی ذمہ دار ادیب اور محتاط محقق شواہد و دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ اس کو قدم قدم پر ماخذوں کے مطالعے اور حوالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیان میں ایجاز و اختصار، جامعیت و مانعیت، سنجیدگی و متانت، شگفتگی و دل نشینی، اور سب سے بڑھ کر اپنے خیالات میں منطقی حسن ترتیب کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس کا قلم حقیقت رقم تیز چل ہی نہیں سکتا۔ اس سست نویسی کے باوجود میرے کام کی مقدار کچھ کم نہیں ہے۔"

(مکتوب ادیب)

اسلوب بیان۔ نسیم قریشی:۔ "مسعود صاحب شائستگی، سنجیدگی، لطافت، اور حسن خیال کو اسلوب نگارش کے بڑے حسین پیکر میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی طرز تحریر میں ان کی طبیعت کی پوری نفاست جھلکتی ہے۔"

(اردو ادب کی تاریخ۔ کمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۵۵ء)

شارب ردولوی:۔ "ان کی زبان سادہ و سلیس اور انداز شائستگی ہے۔ وہ کسی بات کے پیش کرنے میں زور بیان سے نہیں بلکہ شواہد سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں غیر ضروری الفاظ اور غیر ضروری مترادفات نہیں ہوتے۔"

(جدید اردو تنقید ص ۴۳۰)

صفدر آہ :- "وہ اپنے عہد کے بہت بڑے محقق ہونے کے ساتھ بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ محمد حسین آزاد کے بعد ان سے بہتر ادبی رنگ کسی محقق کی تحریر میں نہیں ملتا۔ ..... ان کے قلم میں تلخی، ہیجان اور اشتعال کہیں نام کو نہیں۔"

علی جواد زیدی :- "مسعود صاحب اردو نثر کے صاحبان اسالیب میں سے ہیں۔ ان کا طرز تحریر قدامیں محمد حسین آزاد اور حالی سے بیک وقت متاثر ہے۔ نہ تو جدید اردو نثر کی طرح جملوں کی ساخت تک میں مغربی تصنیفوں کی نقالی ہے اور نہ عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات کے باعث مصنوعی گراں باری۔ ان کا سنبھلا ہوا انداز بیان صاف، اور شستہ اردو کا اچھا نمونہ ہے۔ استدلال میں متانت کے علاوہ وضاحت اور منطقی زور ہے...... ان سب پر مستزاد ادبی چاشنی ہے جو خشک بحث کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔" (آپ سے ملیے)

نور الحسن ہاشمی :- "لکھنے کا انداز آپ نے ان کی مشہور کتاب 'ہماری شاعری' میں دیکھا ہوگا۔ جو بحث اٹھائی ہے ہر ممکن دلیل اور شواہد سے واضح بلکہ واضح ترین کر دی ہے۔"

خود مسعود صاحب کا قول ہے کہ "بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے سننے والا وہی سمجھے، آسانی سے سمجھے اور اس کے سوا کچھ اور نہ سمجھے۔ دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ سننے والے کو بیان میں ایسی لذت ملے کہ وہ اس کو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتا رہے۔" (ہماری شاعری طبع یازدہم ص ۵۰)

یہ خوبیاں اُن کے ہر بیان میں نمایاں ہیں۔

ادیب کی پہلی اور سب سے زیادہ مقبول تصنیف 'ہماری شاعری' پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی تبصرہ نگاروں نے ان کے اسلوب بیان پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

سید علی عباس حسینی :- "مصنف نے اس مختصر تصنیف میں حالی کی دقیقہ سنجی، شبلی

کی وسعت نظر اور آزاد کی سحر نگاری ایک جگہ جمع کر کے دکھا دی ہے۔"

(رسالۂ نیرنگِ خیال لاہور، اپریل و مئی ۱۹۲۸ء)

علامہ سید سلیمان ندوی:۔ "مصنف کی انشا پردازی، فصاحت کلام اور حسنِ بیان کی داد بھی ضروری ہے۔"

(رسالہ معارف، جنوری ۱۹۲۹ء)

مولانا سید اختر علی تلہری:۔ "جو مطلب وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ الفاظ ختم ہونے سے پہلے مطلب کی صحیح تصویر ذہن میں آجاتی ہے۔ مصنف کی قدرتِ بیان کا یہ قابل فخر کارنامہ ہے۔ ... طرزِ تحریر نہایت شگفتہ، سنجیدہ اور سلیس ہے۔ آزاد اور حالی کا رنگ ایک جگہ سمویا ہوا آپ کے یہاں ملتا ہے۔"

(اخبار سرفراز لکھنؤ، ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء)

پنڈت منوہر لال زتشی:۔ "اسلوب بیان کا کیا کہنا، ہر سطر شاہد ہے کہ آزاد کی نواسنجیوں کا نغمہ لکھنے والے کے دماغ میں سمایا ہوا ہے۔"

(مکتوب مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۲۸ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی:۔ "مصنف صاحب کا تخلص ادیب ہے ... لیکن وہ محض نام کے 'ادیب' نہیں ... حقیقتاً بھی ادیب ہیں۔ زبان و ادب پر انھیں جو قدرت حاصل ہے اس کا نمونہ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے"۔ طولانی اقتباس "ہماری شاعری" پر تبصرہ کے ضمن میں روزنامہ ہمدرد دہلی، ۲۷ جون ۱۹۲۸ء میں نقل کر دیا گیا ہے۔

خواجہ محمد عباد اللہ اختر:۔ "تحریر نہایت شگفتہ اور سلیس ... مصنف کی عمیق نگہی، وسیع النظری اور ادیبانہ سحر نگاری کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے۔" (انگریزی سے ترجمہ)

مولانا عبدالماجد:۔ ان کا اسلوب تحریر بڑا خوش آیند ہے۔ تلخی کا نام ونشان نہیں پھر بھی اپنے مخالفین کی قلعی بڑی بے دردی سے کھولی ہے۔"

(ماڈرن ریویو، کلکتہ، اکتوبر ۱۹۲۸ء)

پنڈت منوہر لال زتشی:۔ "کتاب کا طرزِ تحریر ایسا ہے کہ جس کو پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے اور جو لفظوں کے انتخاب، فقروں کے دروبست، جملوں کی ساخت اور ہلکی مسرت بخش خوش طبعی نثر کے اس عظیم فن کار محمد حسین آزاد کو بار بار یاد دلاتا ہے۔"

(ہندوستان ریویو، کلکتہ، اکتوبر ۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر حفیظ سید:۔ "ان کی تحریر کی وضاحت اور سلاست جو بیک وقت سادہ بھی ہے اور رنگین بھی کتاب کی ایک اور قابل لحاظ خصوصیت ہے۔"

(بامبے کرانکل، بمبئی ۳ جون ۱۹۲۶ء)

ڈاکٹر گیان چند:۔ "تحقیق اور ادبی مضامین کی زبان الگ الگ ہے۔ ادبی مضمون میں آپ عبارت آرائی اور زیبِ داستان سے کام لے سکتے ہیں۔ تحقیقی مضمون میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، مسعود صاحب کے ادبی اور تحقیقی مضامین میں زبان کا یہ فرق نمایاں ہے۔" (تحقیق نمبر)

ڈاکٹر ہاشمی کے سوالات:۔ آپ کا اسلوب بیان کن مصنفوں سے متاثر ہے؟

جواب۔ یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور اس کو سلجھانا بہت مشکل ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت مجھے انگریزی میں اسٹی وینسن، فارسی میں سعدی اور اردو میں محمد حسین آزاد کا اسلوب بہت پسند تھا۔ میری کتاب ہماری شاعری پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کو میں نے انھیں تینوں مصنفوں کے نام معنون کیا تھا۔ کچھ زمانے تک ارادی طور پر ان انشا پردازوں کے اسلوب کی پیروی کی، مگر رفتہ رفتہ یہ روش خود بخود ترک ہوگئی اور معلوم نہیں کن کن اثروں کے ماتحت لکھنے کا ایک

ڈھنگ بندھ گیا ہے۔

سوال:۔ مگر اب بھی تو آپ بعض چیزوں کا ارادی طور پر لحاظ رکھتے ہوں گے؟

جواب:۔ جی ہاں مثلاً صحیح لفظ صحیح محل پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنے امکان بھر عربی لفظوں کی عربی جمع نہیں لاتا۔ اضافی اور توصیفی ترکیبوں میں فارسی کی نہیں، اردو قواعد کی پیروی کرتا ہوں۔ ہندی لفظوں کو عربی فارسی لفظوں پر ترجیح دیتا ہوں، مگر اس شرط کے ساتھ کہ مطلب کے اظہار میں خلل نہ پڑے اور اردو کا مزاج بگڑنے نہ پائے۔ ہماری زبان کے پاس کچھ خوبیاں ذاتی ہیں اور کچھ مستعار۔ میں اپنی تحریروں میں اردو کی ذاتی خوبیوں کو اس کی مستعار خوبیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔

سوال:۔ آپ سادہ نثر پسند کرتے ہیں یا رنگین ہے۔

جواب۔ مجھے نہ شوخ رنگینی پسند ہے نہ کھری سادگی۔ بلکہ سادگی اور رنگینی کا ایک معتدل اور متوازن امتزاج۔ آپ اس کو سادہ رنگینی یا رنگین سادگی کہہ سکتے ہیں۔

ادیب کا ذاتی کتب خانہ

لکھنؤ کے امرا اردو سا علم دوست تھے اور علما و فضلا کی کثرت تھی اور ان کو کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ مگر عہد شاہی کا تموّل ختم ہونے کے بعد انقلاب زدہ گھرانوں نے اثاث البیت کے ساتھ بزرگوں کی جمع کی ہوئی کتابیں بھی بیچ کر کھانا شروع کیں۔ پھر بھی بہت سی کتابیں علم دوستوں نے خرید کر محفوظ کر لیں۔ آخری زمانے میں شاید کسی اور فرد واحد نے اس سلسلے میں اتنی خدمت نہیں کی جتنی مسعود صاحب نے کی۔ انھوں نے آپ بیتی میں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں کئی سال لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھاننے کا ذکر کیا ہے جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں بھی یہی بات یوں لکھی ہے:

"مجھے اردو اور فارسی کتابیں جمع کرنے کا شوق نہیں لت ہے۔ اس دھن میں لکھنؤ کی گلی

گلی گلی خاک چھانی، گوشے گوشے کی تلاشی لی، اور جو پھٹے پرانے ورق کسی پرانی کتاب کے ہاتھ آئے انھیں شوق کے ہاتھوں سے سمیٹ لیا۔"

اپنے ایک مخلص اور ذی علم دوست کے نام ایک خط میں اپنے کتب خانے کے بارے میں لکھا ہے "لکھنؤ میں قلمی اور کم یاب کتابوں کا کوئی قابلِ ذکر کتب خانہ بھی نہ تھا۔ مجھ کو اپنے مجوزہ تحقیقی کاموں کے ماٰخذ اور مصادر خود فراہم کرنا پڑے اور میں نے اپنی محدود آمدنی کا معتد بہ حصہ اور کافی قیمتی وقت صرف کر کے کم یاب کتابوں کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ تیار کر لیا، جس سے اربابِ تحقیق مدد لیتے رہتے ہیں۔ ایک چھوٹے کتب خانے کے لیے بھی جتنا عملہ ضروری ہے وہ تو میرے امکان میں نہ تھا، مگر ایک منشی اور ایک دفتری کی تنخواہ ہمیشہ ادا کرتا رہا۔" (مکتوب ادیب)

ایک قدر شناس کتب فروش۔ لکھنؤ میں پرانی کتابوں کے ایک سن رسیدہ تاجر سے مسعود صاحب جو اکثر کتابیں خریدا کرتے تھے، ایک دن ان کی دکان پر ایک کتاب دیکھ رہے تھے جو عہد شاہی کی کتابت اور طباعت کا بہترین نمونہ تھی اور جس پر شاہی کتب خانے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ کتاب کی قیمت زیادہ مانگی جا رہی تھی اور مسعود صاحب نے کم لگائی تھی۔ اس اثنا میں ایک یورپین نے آکر پوچھا کہ تمھارے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس پر لکھنؤ کے شاہی کتب خانے کی مہر ہو۔ کتب فروش نے وہ کتاب اپنے پیچھے چھپالی اور جواب نفی میں دیا۔ خریدار چلا گیا۔ مسعود صاحب نے کتب فروش سے کہا جو قیمت میں لگا رہا تھا یہ خریدار اُس سے زیادہ دے سکتا ہے۔ بولے وہ کیا خریدے گا۔ کتاب تو آپ کے پاس رہے گی۔ بے شک وہ قیمت تو کتاب کی دے سکتا ہے مگر وہ آپ سے زیادہ کتاب کی قدر بھی کر سکتا ہے؟ اور کم قیمت پر مسعود صاحب کو دے دی۔ مسعود صاحب کبھی کبھی اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔

دوسرا واقعہ۔ مسعود صاحب کو میر کی خود نوشت ذکر میر کی بہت تلاش تھی مگر اُس

کے دستیاب ہونے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ ایک دن پرانی کتابوں کا ایک تاجر چھ کتابیں گھر پر لے آیا۔ آٹھ دس کم یاب مطبوعات کے ساتھ ایک قلمی جلد بھی تھی، جس پر ذکر میر لکھا ہوا دیکھ کر یقین نہ آیا مگر دل بے چین ہو گیا۔ سب کتابوں کی مجموعی قیمت ادا کر کے کتب فروش کو رخصت کر دیا اور قلمی جلد کو غور سے دیکھنا شروع کیا کہ کیا حقیقت میں یہ ذکر میر ہے۔ ورق گردانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شک، یقین میں تبدیل ہو گیا اور اسی دور میں دو کم یاب کتابیں اور ملیں، ایک میر کا فارسی دیوان اور دوسری میر کا رسالہ فیض میر ادیب کا بیان ہے کہ مجھے اپنی عمر میں اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی جتنی اس دن ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ میں سڑک پر دوڑتا ہوا اعلان کرتا پھروں کہ مجھ کو یہ نادر کتابیں مل گئی ہیں۔

(۱) ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں:۔ "ادیب صاحب ۔۔۔ کا نادر کتب خانہ خود انھیں کی محنت اور کوشش سے جمع ہوا ہے۔ علم اور کتاب کے سچے عشق کے بغیر ایسا کتب خانہ تیار ہونا ناممکن ہے۔ گلی کوچوں میں پھر کر ہر قسم کی کمیاب اور نایاب کتابوں کا خریدنا، انھیں بہ شوق پڑھنا۔ پھر اُن پر نوٹ لکھ کر محفوظ کر لینا یہ سارے کام تنہا ادیب صاحب نے اپنے ہاتھ سے انجام دیے ہیں۔۔۔۔۔ بعض موضوعات پر ان کے یہاں کتابوں کا جو ذخیرہ ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔"

(۲) ڈاکٹر اعجاز حسین: "آپ کا ذاتی کتب خانہ نایاب اور کارآمد کتابوں کا بیش بہا خزانہ ہے۔" (مختصر تاریخ ادب اردو، گیارھواں ایڈیشن ۱۹۶۰ء)

(۳) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا بیان ہے:۔ "اردو کا کتب خانہ ایسی نادر کتابوں کا جمع کیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ متعدد کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں اور نہ ہوگا۔ یہ کتب خانہ ہی موصوف کی سب سے بڑی جائداد اور سب سے بہتر کارنامہ ہے۔۔۔۔ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے کتب خانہ میں ملیں گی اتنی کسی ایک جگہ نہ مل سکیں گی۔ اسی طرح انیس کے متعلق کتب اور ان کے مراثی غالباً سب سے زیادہ آپ ہی

کے پاس نکلیں گے۔"

علی جواد زیدی لکھتے ہیں:۔ "مسعود صاحب کا کتب خانہ نادر کتابوں کا حسین مجموعہ ہے...... اس کتب خانے سے طالبان علم برابر مستفید ہوتے ہیں۔ خود مسعود صاحب کا ذوق سلیم ان تشنگان مطالعہ کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ اس کتب خانے میں مرثیوں کے بارے میں تو نادر مخطوطات و مطبوعات ملیں ہی گے، اودھ اور واجد علی شاہ پر بھی بیش بہا کتابیں ہیں۔ واجد علی شاہ بھی مسعود صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا مرکز رہے ہیں۔ وہ رقص و موسیقی کا پرستار، وہ ناٹک اور فنون لطیفہ کا تاج دار، وہ نوآبادیاتی سازشوں اور غداروں کی ریشہ دوانیوں کا شکار اپنی ہستی کی تمام رنگا رنگیوں کے ساتھ مسعود صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔"

علی عباس حسینی کا بیان ہے:۔ "انھوں نے تاریخ اودھ پر بہت سا نیا مواد جمع کر رکھا ہے اور واجد علی شاہ کی بھی تصنیفی، تالیفی و ثقافتی زندگی پر جتنی وسیع ان کی معلومات ہیں اور اس فن کار بادشاہ کی جتنی تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں کسی کے پاس نہیں۔"

شوکت تھانوی اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔ "ان کے کتب خانے میں بہت سی قیمتی چیزیں ہیں اور ان کی قیمت کا راز ان کی نایابی میں ہے.... اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں جن کو لوگ عجائبات کے طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور مسعود صاحب اگر بہت مجبور کیے جائیں تو وہ نوادر اس طرح دکھاتے ہیں جس طرح نظام حیدرآباد نے علامہ اقبال کو اپنے جواہرات کا خزانہ دکھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسعود حسن صاحب کا خزانہ بھی جواہرات سے کم نہیں۔"

ذخیرہ مراثی۔ دیگر مطبوعات و مخطوطات کے علاوہ آپ کے پاس قلمی اور غیر مطبوعہ مراثی کا اتنا بڑا خزانہ محفوظ ہے جس کا عشر عشیر بھی شاید کہیں نہ ہوگا۔ کثرتِ تعداد کے

علاوہ قدامت کے اعتبار سے بھی یہ ذخیرہ بے نظیر ہے۔ شمالی ہند کے قدیم ترین مرثیے جن کی زبان کو اردو کے بجائے۔ ریختہ کہنا مناسب ہے، بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ مرثیے کہیں اور نہیں مل سکتے۔ فارسی مرثیوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

مرزا احمد عسکری لکھتے ہیں:۔ "مسعود صاحب کا پرائیویٹ کتب خانہ خاص طور مجموعہ مراثی قابل دید ہے۔ کتابیں کم یاب و نایاب، نادر قلمی نسخے، ایک ایک کتاب کے متعدد اڈیشن۔ اور مرثیوں کا یہ حال ہے کہ عہد قدیم ۔۔۔ کے مرثیہ گویوں سے لے کر آج تک کے تمام چیدہ مرثیے متعدد الماریوں میں رکھے ہوئے، جن کو دیکھ کر آپ کے تجسس و تلاش، قوتِ انتخاب اور صرفِ زر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نواب نصیر حسین خاں خیالؔ مرحوم نے میرے ساتھ آپ کے مرثیہ خانے کی زیارت کی تھی اور مرثیوں کی کثرت و تنوع دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔"

علی عباس حسینی کہتے ہیں:۔ "مرثیوں کا ذخیرہ جیسا کہ مسعود صاحب نے جمع کیا ہے وہ عالم میں کہیں نہ نکلے گا" ۔ اور نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کی حیرت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔ "یہی حال راجہ امیر احمد خاں والی محمود آباد کا ہوا تھا، جو مراثی جمع کرنے کے خاص طور پر شائق تھے۔"

علی جواد زیدی کا بیان:۔ "مرثیے کی تاریخ و تفسیر و تنقید پر آپ کی تحقیق حرف آخر کا رتبہ رکھتی ہے ۔۔۔۔ تحقیق بڑا ہی جاں گداز کام ہے۔ تاریخ کے اندھیروں کو دماغ اور جگر کا خون جلا کے روشن کرنا پڑتا ہے۔ اس جگر کاوی کو کوئی بھی تفریحاً اختیار نہیں کرتا۔ مرثیوں کی تحقیق اس لیے بھی مشکل تھی کہ پہلے اس طرف بالکل ہی توجہ نہیں کی گئی تھی۔

مسعود صاحب کے ایام شباب میں لکھنؤ میں مرثیہ ایک زندہ صنفِ سخن تھا۔ جس ماحول میں مسعود صاحب رہتے تھے وہ مرثیہ گویوں سے بہت قریب تھا۔ پھر اس صنفِ سخن کو زوال شروع ہوا اور اب تو اسے ختم ہی سمجھئے۔ لیکن مسعود صاحب کے ذوقِ تجسس

پر اس گرم و سرد زمانہ کا کبھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ انھوں نے مرثیے کے نایاب ذخیروں کو دست برد زمانہ سے محفوظ کر کے اپنے قیمتی کتب خانے میں یکجا کر لیا ہے۔ اور اب وہ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مراثی کے سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میر خلیق کے مرثیے عام طور پر نا پید سمجھے جاتے تھے۔ ایک صاحب نے مسعود صاحب سے ان نایابی کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے پاس خلیق کا کلام ہے۔ مسعود صاحب نے کہا جی ہاں ہے۔ انھوں نے پوچھا کے مرثیے ہوں گے۔ مسعود صاحب نے فرمایا کہ آپ زحمت کر کے غریب خانے پر تشریف لائیے تو اس سوال کا جواب دوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے حاضر ہونے میں کوئی تامل نہیں۔ لیکن آخر اس سوال کے جواب کے لیے یہ شرط کیوں ہے۔ مسعود صاحب نے فرمایا یہ شرط اس لیے ہے کہ آرزو کا یہ مصرع میرے سامنے ہے۔

سچ بھی برا وہ جس کو سن کر لوگ کہیں تو جھوٹا ہے

آخر ان صاحب کے شدید اصرار پر انھوں نے کہا کہ خیر جواب تو میں دے دیتا ہوں مگر وہ خطرہ دور نہیں ہوا ہے کہ سچ بھی برا وہ جس کو سن کر لوگ کہیں تو جھوٹا ہے۔

میرے ذخیرۂ مراثی میں خلیق کے تقریباً دو سو مرثیے ہیں۔ ان صاحب نے برجستہ کہا پھر لوگ کیا غلط کہتے ہیں کہ خلیق کے مرثیے دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کے کل مرثیے تو آپ کے پاس ہیں۔ اگر اس ذخیرۂ مراثی کے کل مرثیوں کے محض مطلعے ہی یک جا کر دیے جائیں تو اہل تحقیق کے لیے ایک مستند ماخذ تیار ہو جائے گا۔

ارباب زمانہ کی بے التفاتی کا احساس۔ "ان کے مضامین کی سنجیدگی اور متانت کا ایک خراب پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نام اور کام سے بے توجہی برتی جاتی ہے اور ان کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ انھوں نے چپکے چپکے کام کیا ہے

اور اس لیے ہمارے علمی نقار خانے میں ان کی آواز دب سی گئی ہے۔ چونکہ ان کا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لیے بھی ان کی تالیفات و تصنیفات کو اشتہاری وجہ نہیں مل سکا۔"

(نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۳۹)

کوئی ذکی الحس انسان اس صورتِ حال سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ مسعود صاحب نے اپنے ایک خط میں اپنی تصنیفات وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "کتنی حقیقتیں بے نقاب کیں، کتنی غلطیوں کی اصلاح کی اور کتنی غلط فہمیاں دور کیں۔ لیکن تلخ گوئی اور درشت کلامی سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے۔ نہ اپنا نام اونچا کیا نہ دوسروں کو گرایا۔ اس لیے عام نگاہوں میں کوئی امتیازی درجہ نہ ملا۔"

(مکتوب ادیب)

"ہجری تقویم کے حساب سے چھتر سے اوپر سن ہوا اور اب تک صبح آٹھ بجے سے نو بجے رات تک تقریباً سارا وقت پڑھنے لکھنے ہی میں صرف ہو رہا ہے۔ مگر اس سارے ایثار و انہماک کے باوجود خادمانِ ادب کی فہرست میں اپنا نام اکثر نظر نہیں آتا۔"

(مکتوب ادیب)

راقم حروف بھی دیکھتا ہے کہ جن ادیبوں کا کام مسعود صاحب کی ادبی خدمتوں کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے ان کا نام اس عظیم ادیب کے نام سے دس گنا اونچا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے اسباب وہ بھی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا سبب مسعود صاحب کی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی ہے۔ مدت سے وہ مستقل کتابوں کی تصنیف میں مصروف اور محو رہتے ہیں۔ ادبی رسالوں کے صفحات پر بھی بہت کم نظر آتے ہیں اور ادبی جلسوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مسعود صاحب کو ارباب زمانہ کی بے اتفاقی کا احساس تو ہے مگر ان کی ادبی خدمتوں میں نام و نمود کی خواہش کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اس لیے یہ احساس ان کی ادبی مصروفیتوں میں ذرا بھی مخل نہیں ہے۔ قدرت نے ان کو جس کام کے لیے پیدا کیا ہے اس کا عشق بھی ان کے دل میں ڈال دیا ہے۔ سچ پوچھ

ہے مولانائے روم نے،

ہر کسے را بہر کارے ساختند عشق دے را در دلش انداختند

مستقل مزاجی۔ ادیب کا مزاج جو عہد طالب علمی میں بنا تھا وہ ہر عہد میں اپنے اسی مزاج پر قائم رہے۔ زندگی کے نشیب و فراز نے طالب علمی کے عہد کی کس مپرسی اور بیچارگی کے بعد اوج کامرانی پر پہنچا دیا۔ جو بچپن میں تعمیر ہوئے تھے اور شباب کے ہاتھوں پلے بڑھے تھے ان میں ملازمت کی ابتدائی منازل سے لے کر یونیورسٹی کی پروفیسر شپ پر پہنچنے تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ زندگی کا جو رخ اختیار کیا تھا وہی ہمیشہ رہا اور اب تک ہے۔ یہ ادیب کی پختہ کرداری کا بیّن ثبوت ہے۔

حرف آخر۔ مسعود صاحب کے چشم دید حالات بیان کرنے والوں میں اُن سے بڑے بھی ہیں، چھوٹے بھی ہیں، برابر والے بھی ہیں اور ان کے بیانات ادیب کی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں مگر ان میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے اور ان کے اخلاقی اوصاف اور انسانی محاسن کے بیان میں سب یک زبان ہیں۔ اسی لیے کتاب کا پہلا حصّہ اس شعر پر ختم کیا جاتا ہے۔

کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا

دوسرا حصّہ

خدمات

معاصر مبصروں کی نظر میں

الف: کتب
ب: مضامین و مقالات

زندگی یوں تو فقط بازیِ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

٭

ادیب کے ادبی کارنامے مبصروں اور ناقدوں کی نظر میں
سنین اشاعت کی ترتیب سے

ادیب کی بیشتر تحقیقی کتابوں میں ماخذوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ ہم ایسی ہر کتاب کا سال اشاعت درج کر کے اس کے ماخذوں کی تعداد لکھ دیں گے تاکہ مواد کی جستجو میں مصنّف کی کاوش کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ ماخذوں کی مجموعی تعداد اور گوناں گوں نوعیت ادیب کی کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات کا بیّن ثبوت ہے۔

*

ضروری گزارش

پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور مسٹر جی، ایم شاہ نے جناب ادیب سے ملاقات کر کے ان کے ادبی شغلوں اور کارناموں کے بارے میں سوالات پوچھے۔ یہ ملاقاتیں بالترتیب ۲۸ جون سنہ ۱۹۶۱ء، ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ء اور ۲ فروری ۱۹۶۶ء کو لکھنؤ ریڈیو سے نشر کی گئیں۔ ان ملاقاتوں میں بہت سی کار آمد باتیں خود ادیب کی زبان سے معلوم ہوئیں۔ ملاقات کرنے والوں کے سوال اور ادیب کے جواب مناسب موقعوں پر پیش کیے جائیں گے۔

مضامین و مقالات کی تعداد
موضوعات کے اعتبار سے

ادیب کی کتابیں اور ان کے مختلف ایڈیشنوں کے سنینِ اشاعت ایک نظر میں

۱۔ امتحانِ وفا — سنہ ۱۹۲۰ء

۲۔ ہماری شاعری — سنہ ۱۹۲۷ء و سنہ ۱۹۲۹ء و سنہ ۱۹۳۵ء و سنہ ۱۹۴۴ء

" " " — و سنہ ۱۹۵۳ء، سنہ ۱۹۵۶ء، سنہ ۱۹۵۹ء، سنہ ۱۹۶۲ء،

" " " — سنہ ۱۹۶۳ء، سنہ ۱۹۶۴ء، سنہ ۱۹۶۶ء، سنہ ۱۹۷۱ء

۳۔ فرہنگِ امثال — سنہ ۱۹۳۰ء و سنہ ۱۹۳۸ء و سنہ ۱۹۵۸ء

۴۔ دبستانِ اردو — سنہ ۱۹۲۵ء و سنہ ۱۹۲۹ء

۵۔ فیضِ میر — سنہ ۱۹۲۹ء۔ دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۶۴ء

۶۔ مجالسِ رنگین — سنہ ۱۹۲۹ء

۷۔ روحِ انیس — سنہ ۱۹۳۱ء۔ دوسری اشاعت سنہ ۱۹۵۶ء و

" " — سنہ ۱۹۶۴ء و سنہ ۱۹۶۸ء و سنہ ۱۹۷۳ء

۸۔ تنظیمِ اردو — سنہ ۱۹۳۱ء

۹۔ جواہرِ سخن حصہ دوم — سنہ ۱۹۳۵ء

۱۰۔ شاہکارِ انیس — سنہ ۱۹۴۳ء

۱۱۔ فائز دہلوی اور دیوانِ فائز — سنہ ۱۹۴۶ء و سنہ ۱۹۶۵ء

۱۲۔ متفرقاتِ غالب — سنہ ۱۹۴۷ء و سنہ ۱۹۶۹ء

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط — سنہ ۱۹۴۸ء و بار دوم سنہ ۱۹۶۱ء

۱۴۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ — سنہ ۱۹۵۴ء و سنہ ۱۹۶۴ء

۱۵۔ رزم نامۂ انیس — ۱۹۵۷ء
۱۶۔ تذکرۂ نادر — ۱۹۵۷ء
۱۷۔ فسانۂ عبرت — ۱۹۵۷ء
۱۸۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج — ۱۹۵۷ء و ۱۹۶۸ء
۱۹۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج — ۱۹۵۸ء و ۱۹۶۸ء
۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج — ۱۹۵۸ء۔ ۱۹۶۸ء
۲۱۔ آئینۂ سخن فہمی — ۱۹۵۹ء
۲۲۔ گلشن سخن — ۱۹۶۵ء
۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما — ۱۹۶۶ء
۲۴۔ ایران میں مرثیہ نگاری:
〃 ایک تاریخی جائزہ
۲۵۔ شاعر اعظم انیس — ۱۹۶۶ء
۲۶۔ قواعد کلیہ بھاکھا۔ — ۱۹۶۸ء
۲۷۔ اندر سبھا — ۱۹۶۸ء و ۱۹۶۹ء
۲۸۔ ناٹک بزم سلیمان — ۱۹۶۹ء
۲۹۔ نگارشات ادیب — ۱۹۶۹ء
۳۰۔ اسلاف میر انیس — ۱۹۷۰ء
۳۱۔ شرح طباطبائی اور تنقید
〃 کلام غالب — ۱۹۷۴ء
۳۲۔ سلطان عالم واجد علی شاہ — ۱۹۷۴ء
۳۳۔ مراثی ریختہ — ۱۹ء
۳۴۔ دہلی میں مرثیہ گوئی — ۱۹ء

کتابوں کے سنینِ اشاعت

امتحان وفا

یونانی دواخانہ پریس، الہ آباد سنہ ۱۹۲۰ء

یہ انگلستان کے ملک الشعرا لارڈ ٹینیسن کے ایک بلند پایہ منظوم افسانے اینک آرڈن کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ ہے۔ افرادِ قصہ غریب خاندان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں جو بچپن میں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دونوں لڑکوں کو لڑکی سے معصومانہ محبت تھی اور دونوں اس کے ساتھ شادی کے خواہش مند تھے۔ جب شادی کا سن آیا تو اینک کے ساتھ اینی کی شادی ہوگئی۔ فلپ کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد اینک دس سال بے پتا رہا اور آخرکار اس کی موت کا یقین ہوگیا۔ اب اینی کی شادی فلپ کے ساتھ ہوگئی۔ کچھ مدت کے بعد اینک وطن واپس آگیا۔ مگر اس نے اپنی واپسی کو اپنی وفات تک کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ افسانے کے تینوں افراد وفاداری کے سخت امتحانوں کی منزل سے گزرے اور ہر امتحان میں پورے اُترے۔ اس طرح افسانے کے ترجمے کا نام امتحان وفا پورے قصے کا خلاصہ ہے۔ اور اسی کی مناسبت سے کتاب کے سرورق پر حافظ کا یہ شعر لکھا گیا ہے:۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ترجمے کے بارے میں مترجم کا نظریہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے ان سوالوں سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے ایک ملاقات میں ادیب سے دریافت کیے۔ یہ ملاقات لکھنؤ ریڈیو سے ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو نشر کی گئی۔ وہ سوال و جواب حسب ذیل ہیں:

سوال۔ آپ کا سب سے پہلا ادبی کام کون ہے؟

جواب۔ آج سے چوالیس سال پہلے ۱۹۱۸ء میں میں نے انگلستان کے ملک الشعرا

ٹینیسن کے ایک منظوم افسانے اینک آرڈن کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا، جو دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں امتحان وفا کے نام سے شائع ہوا۔ میری ادبی زندگی اسی ترجمے سے شروع ہوئی۔

سوال۔ آپ لفظی ترجمہ پسند کرتے ہیں یا آزاد ترجمہ؟

جواب۔ ترجمہ لفظوں کا نہیں جملوں اور فقروں کا ہونا چاہیئے۔ مگر اس طرح کہ کسی لفظ کا مفہوم چھوٹ نہ جائے۔ اس طرح کا ترجمہ لفظی بھی ہوتا ہے اور آزاد بھی۔

سوال۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ترجمہ بیک وقت لفظی بھی ہو اور آزاد بھی؟

جواب۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔ انگریزی کا ایک جملہ ہے

The carpets in that room were more grand than artistic.

ایک معروف و مقبول ادیب نے اس جملے کا ترجمہ یوں کیا ہے "اس کمرے کے مفروشات بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے"۔ یہ ہوا محض لفظی ترجمہ کہ انگریزی کے ہر لفظ کی جگہ پر اردو کا ایک لفظ بٹھا دیا۔ Carpets، مفروشات grand محتشم artistic صنعت کارانہ۔

اردو والوں کے محاورے میں مفروشات کوئی لفظ نہیں اور فرش کی صفت محتشم نہیں ہو سکتی۔ پھر artistic کے لفظی ترجمے نے تو جملے کی ہیئت ہی بگاڑ دی۔ "بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے"۔ یہ فقرہ اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اب اس جملے کا لفظی اور آزاد ترجمہ سنیے۔ لفظی اس معنی میں کہ ہر لفظ کا مفہوم ترجمے میں موجود ہے اور آزاد اس لیے کہ لفظوں کے استعمال اور جملے کی ساخت میں انگریزی کی

تقلید نہیں کی گئی ہے۔ اصل جملہ اور اس کا ترجمہ ذرا غور سے ملاحظہ کیجئے۔

The carpets in that room were more grand than artistic

میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں۔ اس کمرے کے فرش جتنے پرکار تھے اس سے زیادہ شاندار تھے۔

اینگ آرڈن کے دو تین ترجمے اردو ہو چکے ہیں۔ ادیب کے مندرجہ بالا بیان کو نظر میں رکھیے اور امتحان وفا کا ان ترجموں سے مقابلہ کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ امتحان وفا فن ترجمہ کا ایک شاہکار ہے۔ امتحان وفا کی عبارت کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

"پہاڑ پر چوٹی تک درخت لگے ہوئے ہیں۔ سبزہ زار اور جنگل کے درمیان کے کشادہ راستے اس طرح چکر کھاتے ہوئے اوپر کو گئے ہیں گویا آسمان پر جانے کے لیے سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ ناریل کے پتلے پتلے درخت پتیوں کے تاج پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ خوشنما اور چمکدار چڑیاں اور کیڑے کوڑے بجلی کی طرح ادھر سے ادھر آجا رہے ہیں۔ لمبی لمبی خوشنما بیلیں بڑے بڑے تنوں میں لپٹی ہوئی سمندر کے کنارے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی چمک اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ غرضکہ منطقہ حارّہ کے رنگا رنگ اور شاندار منظر ہر وقت اینگ کے پیش نظر رہتے ہیں۔ مگر اس کی آنکھیں جس چیز کو ڈھونڈھتی ہیں یعنی انسان کی موہنی صورت وہی نہیں دکھائی دیتی اور اس کے کان جس پیاری آواز کے مشتاق ہیں وہی نہیں سنائی دیتی۔ ورنہ یوں تو وہ بہت سی آوازیں سنا کرتا تھا۔ ہزاروں طرح کی مرغابیوں کا بولنا، میلوں لمبی لہروں کا پتھریلی چٹانوں سے ٹکرانا، اونچے اونچے درختوں کی سرسراہٹ تیزی سے بہنے والے چشموں کی جھر جھراہٹ۔"

سخن سنج مترجم نے جگہ جگہ مناسب حال اشعار درج کیے ہیں۔ بعض اشعار میں شاعر کا تہہ در تہہ ذہنی پس منظر گرفت میں نہیں آتا اور یہ نہیں کھلتا کہ کس طرح کا واقعہ کیسی

حالت، کیا کیفیت ہوگی جو ان شعروں کی تصنیف کی محرک ہوئی، جیسے غالبؔ کے یہ شعر:۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

پورا قصہ اکیس فصلوں میں بیان کیا گیا ہے اور یہ شعر ایسی فصلوں کا سرنامہ قرار دیے گئے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے سارا ایس منظر واضح ہو جاتا ہے۔

اکیسویں فصل میں اینک کے مرنے کا حال ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس حادثے کا اینی پر کیا اثر ہوا۔ فطرت شناس مترجم نے ایک شعر لکھ کر اس پر نمبر ۲۲ ڈال دیا ہے اور اس طرح اس کو قصے کی آخری فصل قرار دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:۔

نیرنگ حسن و عشق کی وہ آخری بہار
تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

امتحان وفا میں افسانے کے ترجمے سے پہلے تین عنوان ہیں۔ معذرت، گزارش اور دیباچہ۔ یہ عنوان ادیب کے اسلوب نگارش کے اولین نمونے پیش کرتے ہیں 'معذرت' کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"ٹینیسن کا کلام اور اردو میں ترجمہ پھر ترجمہ کرنے والا میں۔ زبان انگریزی کے سامنے اردو میں انگریزی کی سی وسعت کہاں سے لاؤں اور انتخاب الفاظ میں ٹینیسن کیونکر بن جاؤں کہ ایک ایک لفظ سے ایک ایک تصویر کھنچ جائے اور کوزے میں دریا نظر آئے۔ صاف گوئی کہتی ہے کہ جو ہو نہ سکے اس کی ہوس کیوں کی جائے۔ اپنی زبان کو سنوارنے کا شوق جواب دیتا ہے کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ ایسا گوہر بے بہا ہاتھ آئے اور میں اُسے اردو کے دامن میں

ٹانک نہ دوں۔ ممکن ہے کہ میرے گرد آلود ہاتھوں سے اس موتی کی آب میں فرق آگیا ہو مگر کیا عجب ہے کہ ادبی جواہر کے پرکھنے والوں کو کہیں کہیں اس کی اصلی چمک دمک نظر آجائے۔ بہر حال یہ تصفیہ تو حق پسند ناظرین کریں گے کہ اس سے لباس اردو کی خوشنمائی میں کچھ اضافہ ہوا یا میری یہ کوشش نادان کی دوستی کا مصداق ٹھہری۔ میرے اطمینان کے لیے حسن نیت کا ثواب کافی ہے۔

تبصرے

"اس وقت کے جواں سال مترجم نے ٹینیسن کی نظم کی روح کو بڑی محنت سے اردو نثر میں منتقل کیا۔"

صفدر آہ ۔ ماہنامہ کتاب، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۶ء

"امتحان وفا کے نام سے سید مسعود حسن بی، اے ادیب نے انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ ٹینیسن کے منظوم افسانے کا سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ عموماً ترجمے میں وہ خوبیاں قائم نہیں رہتیں جو اصل زبان میں ہوتی ہیں۔ لیکن جناب ادیب اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اصل افسانہ بہت ہی پُر اثر ہے۔ مگر امتحانِ وفا میں بھی وہ تاثیر زائل نہیں ہونے پائی۔"

ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۲۲ء

ہماری شاعری

گیارہ ایڈیشن۔ سنین اشاعت ۱۹۲۶ء، ۲۹، ۳۵، ۴۴، ۵۳، ۵۶، ۵۹، ۶۲، ۶۴، ۶۷، ۶۹، ۷۱ء

ہماری شاعری کو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے ۱۹۲۶ء کی ابتدا میں شائع کیا اور کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں قدردانوں کی فرمائش اور طالب العلموں کی خواہش کے مطابق "مصنف کی مختصر آپ بیتی" کتاب میں شامل کی گئی۔ چوتھے ایڈیشن

کے دیباچے میں لکھا گیا کہ مقدمہ کتاب ہر ایڈیشن میں بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس مرتبہ وہ کتاب کا حصہ اول قرار دیا گیا ہے۔ حسبِ معمول اس ایڈیشن میں بھی جگہ جگہ ترمیم اور تبدیلی حذف یا اضافہ کیا گیا ہے اور کہیں کہیں مثالوں میں ردو بدل سے کام لیا گیا ہے۔ ساتویں ایڈیشن کے دیباچے میں کتاب کی تصنیف کے اہم مقاصد بتائے گئے ہیں یعنی شعر کا صحیح ذوق، سخن فہمی کا ملکہ اور نقدِ شعر کی قوت پیدا کرنا اور اردو شاعری کا روشن رخ نمایاں کر کے تعلیم یافتہ طبقے میں اس کا وقار قائم کرنا۔ کتاب کے دیباچے کا حسبِ ذیل اقتباس قابل توجہ ہے" اس مرتبہ کتاب کے مطالب میں کافی اضافے کیے گئے ہیں، حصہ اول میں کم اور حصہ دوم میں زیادہ۔ حصہ دوم میں اضافوں کے علاوہ مضامین کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ایک بہت بڑی تبدیلی اور بھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب اردو شاعری بالخصوص غزل پر تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ اس لیے بنیادی اعتراضوں کو موضوع بحث قرار دے کر ان کے ضمن میں ضروری مسائل کی توضیح کی گئی تھی۔ اب اعتراضوں کا ہنگامہ فرو ہو چکا ہے۔ اس لیے اب وہی ضروری مسائل کچھ نئے مسئلوں کے ساتھ بحث کے اصل موضوع قرار دیے گئے ہیں۔ یہ مسائل نظر میں رہیں گے تو وہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں گی جو اعتراضوں کا سرچشمہ تھیں۔"

اسی ایڈیشن میں کتاب کے نام کے ساتھ 'معیار و مسائل' کے الفاظ شامل کیے گئے اور فہرست مضامین میں حصہ اول کے ساتھ لفظ معیار اور حصہ دوم کے ساتھ لفظ مسائل بھی لکھا گیا۔ ساتویں ایڈیشن کے بعد کتاب کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا لیکن حذف و اضافہ، ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت پر تکلف تھا اسکی کتابت اس وقت کے بہترین کاتب مرزا احمد جواد نے کی اور بڑے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ اس کو اپنے مطبع نظامی پریس

میں چھاپا۔ سرورق سرخ و سبز دو رنگوں میں اور پوری کتاب میں خوبصورت جدول سرخ رنگ میں چھاپا گیا۔ کتاب کتابت اور طباعت، کا اعلیٰ نمونہ بن گئی۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۲۰۰ صفحے اور قیمت صرف دو روپے رکھی گئی۔ کتاب کے صوری اور معنوی حسن نے وہ قبول عام حاصل کیا کہ اس کے شائع ہوتے ہی تحسین و آفرین کی بارش ہونے لگی۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس مقبولیت کا ذکر یوں کیا گیا۔

"مصنف کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا اور کون سا موقع ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی سعی کو مشکور اور اپنی تصنیف کو مقبول دیکھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ادب کے نگاہ دار جوہریوں نے اس کتاب کو تنقید کی کسوٹی پر کس کے دیکھا اور کھرا پایا۔ دور دور سے تعریف اور تہنیت کے خط آئے۔ انگریزی اور اردو اخباروں اور رسالوں میں بیسیوں تبصرے شائع ہوئے۔ ادبی مباحثوں میں اس کے حوالے دیے گئے۔ کہیں یہ کتاب امتحان کے نصاب میں داخل کی گئی۔ کہیں مدرسوں کے کتب خانوں کے لیے خریدی گئی اور اس کا پہلا ایڈیشن ایک سال میں ختم ہو گیا۔"

کثیر التعداد تبصروں میں سے صرف چند کے نہایت مختصر اقتباس آخر میں پیش کیے جائیں گے۔ کتاب انجمن ترقی اردو، حیدرآباد نے شائع کی تھی۔ اس لیے انجمن کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی رائے سب سے پہلے درج کی جاتی ہے۔ ان کی رائے کو خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی نوعیت میں منفرد ہے۔ کوئی دوسرا ناقد یا تبصرہ نگار ان کا ہم خیال نظر نہیں آتا۔ مولوی صاحب کے خاص رفیق کار محمد صدیق حسن اپنے خط مورخہ ۲۷؍ دسمبر ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں۔

"کتاب کو دیکھ کر سخت مایوسی اور افسوس ہوا۔ اور مولوی صاحب قبلہ نے تو اسے بالکل ہی ناپسند کیا۔ ... مولوی صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ اس کتاب کا کیا حشر ہوگا اور کیسے فروخت ہو سکے گی۔ کیونکہ لاگت بہت زیادہ آگئی۔ اگر جلد بندی (Full Cloth) کے بعد ایک روپے پر فروخت ہو سکتی تو البتہ نکل جاتی۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے اور شاید پندرہ بیس برس میں بھی پانسو نسخے نکل سکیں تو غنیمت ہے۔"

مصنف کی ہمت شکنی اور کتاب کی بے وقعتی اس سے زیادہ کیا ہوتی۔ یہ اشاعت و تجارت کتب کے ایک بڑے تجربہ کار ماہر کی رائے ہے اس کتاب کے بارے میں جس کا پہلا ایڈیشن ایک سال میں نکل گیا اور گیارہ ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ کئی ایڈیشن ایمان فروش ناشروں اور تاجروں نے مصنف کی اجازت کے بغیر چھاپ لیے۔

ہماری شاعری کی بیت شماری

کسی مسئلے کی وضاحت، کسی دعوے کی دلیل، کسی قول کی سند یا کسی چیز کی مثال کے لیے جن شاعروں کا کلام پیش کیا گیا ہے ان کی تعداد ستتر اور ان کے اشعار کی تعداد چار سو دس ہے۔ شاعروں کے تخلص حروف تہجی کی ترتیب سے اور ہر شاعر کے اشعار کی تعداد تخلص کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

ابر ۲۔ آتش ۵۔ اثر ۴۔ ادیب ۲۔ آرزو ۷۔ افسوس ۱۔ اقبال ۱۲۔ اکبر ۱۳۔ امانت ۲۔ انشا ۱۔ انور ۱۔ انیس ۲۰۔ اوج ۱۔ بائرن ۲۔ بحر ۱۔ بیخود موہانی ۳۔ تعشق ۱۔ تلسی ۲۔ ثاقب ۲۔ جرأت ۱۔ جوش ۹۔ جوہری ۱۔ چکبست ۳۔ حافظ ۵۔ حالی ۷۔ حسرت ۳۔ حسن میر ۳۔ خسرو ۳۔ داغ ۱۲۔ دبیر ۵۔ درد ۷۔ دلگیر ۲۔ ذوق ۸۔ راغب ۱۔ رضا ۱۔ رند ۱۔ رواں ۳۔ رومی ۲۔ ریحاں ۲۔ سراج دکنی ۳۔ سعدی شیرازی ۲۔ سودا ۲۰۔ سید (مفتی محمد عباس) ۱۔ شاد عظیم آبادی ۳۔ شاد لکھنوی ۷۔ شبلی ۲۔ شرم ۲۔ شیریں ۲۔ صفی ۱۳۔ ظفر ۱۔ عالم ۱۔ عرفی ۴۔ عزیز ۱۔ عشرت ۱۔ عنصری ۱۔ عیشی ۱۔ غالب ۴۔ فانی ۱۔

فردوسی ۱۔ فغانی ۱۔ قائم ۱۔ قلق ۱۔ مرزا (رسوا) ۱۔ مشتری ۱۔ مصحفی ۹۔ مظہر ۱۔ مومن ۷۔ میر ۲۹۔ ناسخ ۵۔ نظام ۱۔ نظیر ۱۔ نظیری ۱/۲۔ نفیس ۱۔ وزیر ۳۔ ہوش ۱۔ یاس ویگانہ ۵۔ یقین ۳۔

تبصرے اور رائیں

(کثیر التعداد تبصروں میں سے صرف چند کے نہایت مختصر اقتباسات)

ڈاکٹر سید عابد حسین

"سید مسعود حسن رضوی سارے قدر دانان اردو کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہماری شاعری کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے ہم بے تکلف یورپ کے بہترین نقادوں کی تصنیف کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔"

(رسالۂ جامعہ دہلی۔ مارچ ۱۹۲۸ء)

سید علی عباس حسینی

"نقد شعر کی قوت، اور سخن فہمی کا ملکہ پیدا کرنے میں بھی یہ کتاب بے نظیر ہے... مصنف نے جہاں اشعار کا مطلب لکھا ہے، اور تمثیلی اشعار کو واقعات عالم پر منطبق کیا ہے، وہاں سخن فہمی کا اعجاز دکھایا ہے......جناب مصنف ہزاروں مبارکبادوں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مختصر تصنیف میں حالی کی دقیقہ سنجی، شبلی کی وسعت نظر اور آزاد کی سحر نگاری ایک جگہ جمع کر کے دکھا دی ہے۔" (رسالۂ نیرنگِ خیال، لاہور۔ اپریل و مئی ۱۹۲۸ء)

علامہ سید سلیمان ندوی

"مصنف نے جس تفصیل، جس خوبی، جس شگفتگی، جس خوش اسلوبی اور جن مختلف پہلوؤں سے ہماری شاعری پر نظر ڈالی ہے، اور جس طرح سے نگاہوں کے اوجھل نکتوں کو منظر عام پر لائے ہیں، وہ صد درجہ تحسین و داد کا مستحق ہے اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اردو شاعری کی تنقید

تبصرہ بر مقدمۂ حالی کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسری تصنیف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مصنف کی انشا پردازی، فصاحت کلام، اور حسن بیان کی داد بھی دینی ہے ۔"

مولانا اختر علی تلہری

"مصنف کی نکتہ رسی کی داد دینا پڑتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دلائل کی متانت کا اعتراف ناگزیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصنف نے علم معانی کے بہت سے نکتے لکھے ہیں جن میں ۔ ۔ ۔ ۔ قابل مدح ندرت پائی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جو مطلب وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ الفاظ ختم ہونے سے پہلے مطلب کی صحیح تصویر ذہن میں آجاتی ہے مصنف کی قدرت بیان کا یہ قابل فخر کارنامہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طرز تحریر نہایت شگفتہ، سنجیدہ اور سلیس ہے ۔ آزاد اور حالی کا رنگ ایک جگہ سمویا ہوا آپ کے یہاں ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ادبی کارنامہ اس قابل ہے کہ اسے عزت واحترام کے سر پر جگہ دی جائے ۔"

(اخبار سرفراز، لکھنؤ ، ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی

"مصنف صاحب کا تخلص ادیب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ محض نام ہی کے ادیب نہیں ہیں حقیقتاً بھی ادیب ہیں ۔ زبان و ادب پر انھیں جو قدرت حاصل ہے اس کا نمونہ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی کتاب مقدمۂ حالی کا ۔ ۔ ۔ ۔ تکملہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا حالی کا نقطہ نظر تمام تر اخلاقی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے مصنف ادیب کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف تمام تر ادبی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا کے مقدمے اور ان کی کتاب میں (بہ زبان اکبر) وہی فرق ہے جو یخنی کے پیالے اور شراب کے گلاس میں ہو سکتا ہے ۔"

(اخبار ہمدرد، دہلی ، ۱۷ جون ۱۹۲۸ء)

اخبار حقیقت، لکھنؤ ۔ ۳۱ اگست ۱۹۲۸ء

"مصنف کو بالکل اچھوتے مسائل پر غور کرنا پڑتا ہے . . . . ایک ایک جملہ معلوم کتنی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے . . . . . ایسی دل کش، دل نشین، بجست اور ندرتوں سے پر عبارت لکھی ہے کہ ایک زمانہ اس کا معترف ہے . . . . . ہماری شاعری کے مطالب کی نوعیت اور انداز بیان کی دل کشی بہ آواز بلند کہہ رہی ہے "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔"

حامد اللہ افسر میرٹھی

"طرز بیان نہایت شگفتہ اور دل نشین ہے اور مطالب میں تازگی اور جدت ہے . . . . . حقیقت یہ ہے کہ خواجہ حالی کے مقدمے کے بعد اس موضوع پر جس قدر کتابیں شائع ہوئیں ہماری شاعری ان سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے اور . . . . ہر حیثیت سے مقدمۂ شعر و شاعری کے ہم پلّہ ہے . . . . اگر خواجہ حالی زندہ ہوتے تو ہماری شاعری کی دل کھول کر داد دیتے۔ (اخبار سرفراز لکھنؤ ۷ ستمبر ۱۹۲۸ء)

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی۔ صدر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی

"کتاب کا کیا کہنا، "خوب ہے" اور بہت ہی خوب۔ اردو میں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ایک بہت ہی الجھے ہوئے مضمون کو اس سہل طریقے سے سلجھانا اور ایسے سلیس اسلوب سے سمجھانا آپ ہی کا کام تھا۔ عبارت کی طرز ایسی کہ پڑھ کر زبان سے بے اختیار ماشاءاللہ نکل جاتا ہے . . . . مجھے پوری امید ہے کہ یہ آپ کی چھوٹی سی کتاب ہمارے نوجوانوں کے لیے ذوق سلیم کی راہ میں خضر کا کام کرے گی۔ حالی کی شعر و شاعری کے روشن چراغ کے نیچے جو ہلکا سا اندھیرا لازماً رہ گیا تھا، اسے ہماری شاعری نے دور کرکے اردو ادب کی بزم کو ہر طرف سے منور کر دیا ہے۔ اگر مولانا حالی اس وقت زندہ ہوتے ہوتے تو وہ آپ کی کوشش کی یقیناً داد دیتے۔"

پنڈت منوہر لال زتشی۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس

"خیالات پاکیزہ، اصول صحیح اور تنقید کی کسوٹی پر کسے ہوئے۔ اسلوب بیان کا کیا کہنا۔ ہر سطر شاہد ہے کہ آزادی کی نوا سنجیوں کا نغمہ لکھنے والے کے دماغ میں سمایا ہوا ہے ...... کتاب کا ہر ورق گواہ ہے کہ آپ نے بہت کچھ پڑھا ہے اور جتنا پڑھا ہے اس سے زیادہ اس کے حسن و قبح پر غور کیا ہے۔"

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی

"غزل اور پرانی چال کی شاعری کی حمایت میں آج تک جتنا لکھا گیا ہے اور میرے علم میں آیا ہے اس میں یہ مضمون بہترین ہے جو قابلیت اور تحقیق آپ نے اس مضمون میں صرف کی ہے بے شک داد کے قابل ہے۔" (ہماری زبان ۱۵ ار اگست ۱۹۶۸ء)

خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد سی، آئی، او، بی، ای، آئی، ایس، او

"میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی نہایت دلچسپ اور درخشاں تصنیف سے زبان اردو کو بچانے اور زندہ رکھنے کی بڑی منزل طے کرلی۔ آپ کا طرز بیان نہایت دل کش اور دلائل برجستہ ہیں۔ اگر ایسے ہی دس بیس مردمیدان پیدا ہوجائیں تو اس کس مپرسی کے زمانے میں بھی اردو زندہ رہ سکتی ہے۔"

مرزا احمد عسکری مترجم تاریخ ادب، اردو مولف نوادر آئینہ بلاغت، ادبی خطوط غالب، من کیستم وغیرہ

"مجھ کو یہ کتاب خواجہ حالی کی شعر و شاعری سے زیادہ پسند ہے .... میرے دل پر تو اس کتاب نے ایسا اثر کیا کہ اگر بالفرض میں جوان اور زمانۂ حال کے فرقہ مشککین میں سے ہوتا تو یقیناً "آمنت بہذا الکتاب" کہہ کر اپنا مسلک دل دیتا۔"

مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی، مصنف، آیات وجدانی، ترانہ، چراغ سخن، غالب شکن، شہرت کاذبہ وغیرہ

"ہماری شاعری کے مطالعے سے خیالات میں نہایت صحیح انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

یورپ زدہ دماغوں کی اصلاح کے لیے یہ نہایت صحیح نسخہ ہے ۔۔۔۔ اردو اور فارسی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح روشنی میں دیکھنے کے لیے ایک خاص معیار قائم کرنا پڑے گا، اور یہ معیار ہماری شاعری میں قائم کر دیا گیا ہے ۔

تعلیم یافتہ اصحاب نظری حیثیت سے تو شعر و سخن کے فلسفے اور نصب العین پر بہت کچھ خامہ فرسائیاں کرتے ہیں، مگر اب تک کوئی ایسی تصنیف نظر سے نہیں گزری جو شعر کہتے وقت عملی طور پر اصولی حیثیت سے شاعر کو مدد دے سکے۔ نہ ایسی کوئی تصنیف دیکھی جس سے شعر فہمی کا ملکہ پیدا ہو سکے اور مغز سخن تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم ہو سکے۔ البتہ آپ کی اس تصنیف نے شعر فہمی کی بہت سی راہیں کھول دی ہیں، جن کی بدولت ایک صحیح المذاق بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے ۔"

خواجہ محمد عباد اللہ اختر بی، اے، امرتسری مصنف مشاہیر اسلام، صدیق اکبر، ام القریٰ، بغداد، دمشق وغیرہ

"جناب ادیب صاحب کی تصنیف ادب اردو میں فن تنقید پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔۔۔۔ تحریر نہایت شگفتہ اور سلیس، مطالب بے حد سنجیدہ اور اچھوتے کتاب شروع سے آخر تک محاسن مملو ہے ۔۔۔ کتاب کے مطالعے سے مصنف کی نکتہ سنجی، وسیع النظری اور ادیبانہ سحر نگاری کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ زبان اردو میں یہ کتاب ایک گراں مایہ اضافہ ہے ۔۔۔ سید مسعود حسن رضوی بلا شبہ اس قابل ہیں کہ انھیں مغربی نقادانِ فن کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے ۔۔۔۔۔ مضامین کی ترتیب مصنف کی بالغ نظرانہ پختہ کاری کی دلیل ہے ۔"

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

"آپ کی کتاب 'ہماری شاعری' اردو تنقید میں ایک بیش اضافہ ہے۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بہت زیادہ محسوس

ہو رہی تھی۔ ہماری شاعری کا وجود بہت بر وقت ہوا۔" (مختصر تاریخ ادب۔ گیارھواں اڈیشن ص ۴۹۷-۴۹۸)

نسیم قریشی

"پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ساری عمر مشرقی شعر و ادب کے بہت سنجیدہ مطالعے میں گزری ہے۔ انھوں نے بڑے ریاض اور محنت سے اردو شاعری کے حسن باطن تک رسائی حاصل کی ہے اور گہری ہمدردی کے جوش میں ڈوب کر اسے بے نقاب کیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'ہماری شاعری' ان کی اعلیٰ شعر فہمی، نکتہ آفرین ذہن اور گہرے ادبی انداز فکر پر پوری طرح دلالت کرتی ہے۔" (اردو ادب کی تاریخ)

فرہنگِ امثال

طبع اول شانتی پریس الٰہ آباد، ۱۹۳۷ء، طبع دوم شانتی پریس الٰہ آباد، ۱۹۳۹ء

طبع سوم نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۸ء

"فارسی کے بہت زیادہ اور عربی کے کم فقرے، جملے، مصرعے اور شعر ضرب المثل ہو گئے ہیں اور اردو تحریر و تقریر میں کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ان زبانوں سے ناآشنا ہیں انھیں ان کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اظہار قابلیت کے لیے فارسی عربی کے امثال جا بیجا لکھ مارتے ہیں جس سے قابلیت کی جگہ ناقابلیت کا اظہار ہوتا ہو" پیش نظر کتاب میں صرف وہ مثلیں درج کی گئی ہیں جو اردو میں رائج ہیں۔ اس پابندی کے باوجود یہ فارسی مثلوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے جو مرتب اور مطبوعہ صورت میں سامنے آیا ہے۔ عربی مثلیں بھی بہت ہیں۔ مثلوں کی مجموعی تعداد بارہ سو باسٹھ ہے، جو انگریزی ڈکشنری کے لفظوں کی طرح حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مثلوں کی ترتیب میں جن باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ان کی وضاحت کتاب کے دیباچے میں کر دی گئی ہے۔ مثلوں کا با محاورہ اردو میں لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں لفظی ترجمہ سے مطلب خبط ہو جانے کا اندیشہ تھا وہاں مثل کی شرح کر دی گئی ہے اور جہاں شرح سے بھی مثل

کا محل استعمال معلوم نہیں ہوتا وہاں اس کا محل استعمال بھی بتایا گیا ہے۔ مثلاً گرگِ باراں دیدہ؛ گوشتِ خرد ندان سگ؛ لاحول ولا قوۃ؛ کے لغوی معنی علی الترتیب یہ ہیں وہ بھیڑیا جو برسات دیکھ چکا ہو؛ گدھ گوشت اور کتے کے دانت؛ نہ مدد ہے نہ قوت لیکن صرف ان کے معنوں سے محل استعمال سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ایسی تمام مثلوں کا محل استعمال بھی بتادیا گیا ہے۔

یہ کتاب آج سے ۳۵ برس پہلے پہلی مرتبہ شائع کی گئی تھی اور ظاہر ہے کہ اتنی مثلوں کی فراہمی ترتیب، ترجمہ اور شرح میں بہت وقت صرف ہو چکا ہوگا۔ اس وقت اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں میں فارسی دانوں کی تعداد آج کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس لیے اردو ادب کے طالب علموں کے لیے اب اس کتاب کے حوالے کی ضرورت اور افادیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

دبستانِ اردو

بار اول ۱۹۳۵ء، بار دوم نیشنل پریس، الہ آباد ۱۹۳۹ء

مولف کتاب سید مسعود حسن رضوی ادیب فن تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے سند یافتہ (ال۔ ٹی) ہیں۔ انھوں نے اصول تعلیم کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب تیسرے اور چوتھے درجے کے بچوں کے لیے "تالیف کی ہے۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں "کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب زبان کی پاکیزگی اور خوبصورتی میں، سبقوں کی نوعیت اور ترتیب میں اور ادب واخلاق کی تعلیم میں موجودہ درسی کتابوں سے بہتر ہو۔"

"بعض سبق دوسری درسی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ لیکن صرف عنوان یکساں ہیں بیان یکساں نہیں۔ ان کا باہمی مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ لطف زبان، حسن بیان اور اخلاقی نتائج وغیرہ میں کتنا فرق ہے۔"

کتاب کی ابتدا 'پریم کا گیت' سے کی گئی ہے جو درج ذیل ہے

بھارت ماتا سب کی مائی　　سب ہندی ہیں بھائی بھائی
من میں بہائیں پریم کی گنگا　　ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

یہ گیت، بچّوں میں قومی یکجہتی اور غیر فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔

سبق تدریجی طور پر زیادہ معلوماتی اور زیادہ ادبی ہوتے گئے ہیں۔ مولف کے لکھے ہوئے سبقوں میں سے ابتدائی، درمیانی اور آخری سبقوں کے چند مختصر اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر سبق کا عنوان لکھ دیا گیا ہے یہ اقتباس مولف کے نصف صدی پیشتر کے اسلوبِ نگارش کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان سبقوں میں فارسی کا عطف اور اضافت کہیں نہیں ہے

درخت

گرمی کے موسم میں دھوپ سے ترستے ہوئے، پسینے میں شرابور مسافر کو جب راستے میں کوئی چھتنار درخت مل جاتا ہے اور وہ اس کی گھنیری چھاؤں میں دم لینے کے لیے ٹھہر جاتا ہے، اس وقت اس کے دل سے پوچھو کہ درخت خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

گرمی کا دن

جن لوگوں کو خدا نے دولت دی ہے وہ گرمی کی تکلیف سے بچنے کے لیے طرح طرح کے سامان کرتے ہیں۔ کوئی تہہ خانے میں آرام کر رہا ہے، کوئی خس خانے میں لیٹا ہوا ہے، خس کی ٹٹیاں چھڑکی جا رہی ہیں، پنکھا چل رہا ہے۔ وہی لو جو باہر آگ برساتی ہے، خس کی ٹٹیوں میں ہو کر کمرے کے اندر جاتی ہے تو گلابی جاڑوں کا مزہ آتا ہے۔

اکبر بادشاہ

سب سے پہلا معرکہ جو اکبر کو پیش آیا یہ تھا کہ ہیموں نامی ایک ہندو سردار ایک بڑی دل فوج لے کر چڑھ آیا۔ مشیروں نے اکبر کو صلاح دی کہ اتنے بڑے لشکر سے لڑنا موت کے منھ میں جانا ہے۔ بہتر ہے کہ دلّی کی سلطنت سے ہاتھ دھوئیے اور کابل کو واپس چلیے۔ مگر نوجوان بادشاہ جی کا مضبوط، ہمّت کا دھنی تھا۔ یہ بزدلی کی صلاح اُسے پسند

نہ آئی۔ مقابلے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی ہیموں جی توڑ کر لڑا مگر اکبری فوج کی بہادری اور بیرم خاں کی دانائی کے آگے ایک نہ چلی۔ آخر اس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ اب ہمایوں بیچارے کا حال نہ پوچھو۔ زمین سخت آسمان دور، نہ چلنے کو پاؤں نہ بیٹھنے کو ٹھاؤں۔

نور جہاں

ابھی مرزا غیاث کو گھر سے نکلے ہوئے بہت دن نہ ہوے تھے کہ اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی کیا تھی چاند کا ٹکڑا اور کی پتلی تھی۔ اس کا نام مہرالنسا رکھا۔ بیچارے ماں باپ دکھ بھرتے، مصیبتیں جھیلتے، منزلیں مارتے چلے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں یہ پیارا بچہ بھی جان کا وبال ہو گیا۔

دونوں حیران تھے کہ کیا کریں اور بچے کو کس کے سپرد کریں۔ جنگل بیابان کا واسطہ نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ ایسے وقت میں انسان کا دھیان اسی کی طرف پہنچتا ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ انھوں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو ایک جھاڑی کے نیچے لٹا کر خدا کے سپرد کر دیا اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر پھر چل کھڑے ہوے۔

مرزا غیاث کا دل بھر آیا۔ واپس گیا۔ دیکھا کہ معصوم بچی اکیلی پڑی ہوئی ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ وہ حسن کی ننھی سی مورت اس لق ودق میدان میں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے سر شام آسمان پر پہلا تارا۔

مہرالنسا نصیبے کی سکندر تھی کہ جنگل میں پیدا ہوئی اور محلوں میں پلی۔ ماں باپ کے لیے بھی وہ گویا رحمت کا فرشتہ تھی۔ اس کے پیدا ہوتے ہی ان کی سوتی ہوئی قسمت جاگ اٹھی۔ ایک دن وہ تھا کہ مرزا غیاث کوڑی کوڑی کو محتاج، فاقہ مست، جنگلوں کی راہ پا پیادہ طے کرتے چلے جا رہے تھے۔ اب وہی مرزا غیاث ہیں کہ عزت اور ترقی کے قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ کل کچھ تھے تو آج کچھ ہیں۔ شاہی دربار میں بھی ان کی بات پوچھی جاتی ہے۔ مہرالنسا

کی ماں کی عزت بھی روز بروز بڑھتی گئی۔ کہاں خود اپنے پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا میسر نہ تھا۔ کہاں اب نوکر چاکر، ماما ئیں، اصیلیں، سب ہی خدمت کو موجود ہیں۔ سچ ہے خدا کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

تاج محل

ممتاز محل نے خواب میں ایک نہایت خوبصورت عمارت دیکھ کر شاہ جہاں سے فرمائش کی کہ ایسی ہی عمارت مجھے بنوا دو۔

شاہ جہاں تھا عمارتوں کا دلدادہ اور پھر پیاری بیوی کی فرمائش۔ اُس نے جواب دیا کہ جو عمارت تم نے خواب میں دیکھی ہے وہ تو خدا جانے کیسی تھی۔ البتہ میں تمھارے لیے ایک ایسی عمارت بنوائے دیتا ہوں جیسی کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو۔

تاج محل فن تعمیر کا ایک معجزہ ہے۔ نہ زبان اس کی تعریف کر سکتی ہے نہ قلم اس کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

آخر میں ہم لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت صفی کا ایک شعر لکھتے ہیں جس سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تاج محل کتنی عمدہ عمارت ہے۔

دیکھ کر سیر اس کی دنیا سے گزرنا سہل ہے
مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

سکندرِ اعظم

فیلقوس سکندر کا باپ اور ارسطو اس کا استاد تھا۔

ایک دفعہ کسی نے سکندر سے پوچھا کہ آپ کی نگاہ میں فیلقوس کی عزت زیادہ ہے یا ارسطو کی۔ اس نے جواب دیا "ارسطو کی۔ اس لیے کہ فیلقوس مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور ارسطو نے مجھے زمین سے آسمان پر پہنچایا۔

افغانستان اور ترکستان پر قبضہ کر کے سکندر درّہ خیبر کی راہ سے پنجاب میں داخل ہو گیا۔ کہاں مقدونیہ اور کہاں پنجاب۔ مگر سکندر اور اس کے سپاہیوں کی ہمت تو دیکھو کہ راستے کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے، لڑائیاں لڑتے ہوئے، دریاؤں کو ناگھتے، پہاڑوں کو روندتے، برف کاٹتے یونان سے ہندوستان تک چلے آئے۔

اس وقت کا سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ جہلم کے کنارے پر یونانی بہادروں کا لشکر پڑا ہوا ہے۔ سپاہی بھاری بھاری زرہ بکتر پہنے ہوئے، سروں پر آہنی خود رکھے ہوئے، بڑی بڑی ڈھالیں لگائے ہوئے کھڑے ہیں۔

دوسرے کنارے پر ہندوستانی سورماؤں کا پڑاؤ ہے۔ سپاہی تیر، کمان، تلوار، برچھیاں، بھالے لیے ڈٹے ہوئے ہیں اور سینکڑوں ہاتھی دریا کے کنارے کنارے ایک لوہے کی دیوار بنائے ہوئے کھڑے جھوم رہے ہیں۔

یونانی تیر اندازوں نے ہاتھیوں پر اتنے تیر برسائے کہ آخر ہاتھی بھڑک گئے۔ یہ بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ سیکڑوں سپاہی ہاتھیوں سے کچل کچل کر مر گئے، ہزاروں جان کے خوف سے بھاگ گئے اور پورس کی جمی جمائی فوج دم بھر میں تتر بتر ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ سکندر نے کسی نجومی سے اپنی موت کا وقت دریافت کیا تھا۔ نجومی نے کہا تھا کہ آپ اس وقت انتقال کریں گے جب زمین لوہے کی اور آسمان سونے کا ہو جائے گا۔ سکندر کو اس کی بات سن کر بہت تعجب ہوا تھا۔ مگر جب بابل میں پہنچ کر سکندر کو بخار آیا اور اس نے گھوڑے سے اتر کر زمین پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک وفادار سپاہی نے اپنی لوہے کی زرہ زمین پر بچھا دی۔ سکندر اس پر بیٹھ گیا۔ دھوپ تیز تھی ایک سردار نے اپنی سونے کی ڈھال سے اس پر سایہ کر لیا۔ سکندر نے نیچے اوپر نگاہ کی۔ اسے نجومی کی پیشین گوئی یاد آ گئی اور اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ نجومی کی بات سچ نکلی۔ سکندر چند روز بیمار رہ کر اس دنیا سے چل بسا۔ سارا مال و اسباب یہیں رہ گیا۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

مہیا گرچہ کل اسباب ملکی اور مالی تھے
سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

فیضِ میر

پہلا ایڈیشن۔ نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۹ء

دوسرا ایڈیشن۔ بہ اضافۂ فہرست مضامین واشاریہ وفرہنگ۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء

میر تقی میر کا یہ نادر الوجود رسالہ مدت دراز تک نظروں سے پوشیدہ رہا۔ تذکرہ نگاروں کی اکثریت بھی اس کے وجود سے بے خبر رہی۔ صرف محسن نے سراپا سخن میں میر کی تصنیفوں میں ایک رسالے کا نام میر فیض بتایا ہے۔ آزاد نے آب حیات میں میر کے رسالے فیض میر کا صرف نام لیا ہے۔ وہ بھی اس کے موضوع سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ادیب نے اس کو مرتب کر کے ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر پیش کر دیا۔ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی فیض کے لیے لکھا تھا اور انھیں کے نام کی رعایت سے اس کا نام فیض میر رکھا تھا۔ فیض میر کے تفصیلی مقدمے کے کچھ اقتباس ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

"میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں۔ انھیں کی تصانیف میں آزاد نے فیض میر کو بھی شمار کیا ہے۔ جس وقت تک یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اس وقت تک وہ آزاد کا تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اب دیکھیے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی طرح ادبی تحقیق جتنی آگے بڑھتی جائے گی آزاد کے افسانے حقیقت بنتے جائیں گے۔"

"رسالہ فیض میر میں پانچ حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں حکایت سے مراد نہ

بادشاہوں اور وزیروں کے قصے ہیں نہ دیووں اور پریوں کی کہانیاں۔ ان حکایتوں میں میرؔ نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سُنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ یہ واقعات ہوں یا میرؔ کی خوش اعتقادی کے کرشمے، بہرحال ان کی روشنی میں میرؔ کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ میرؔ ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ صوفی درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دل جوئی کو فرضِ انسانیت سمجھتے تھے۔ ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحبِ کرامات مانتے تھے۔ تصوّف اور الٰہیات کے مسائل سے میرؔ کو بڑی دلچسپی تھی۔"

---

* نکات الشعرا اور ذکرِ میر دو آئینے ہیں کہ میرؔ کی سوانح نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر میرؔ کے قلم کی رفتار تصوّف اور الٰہیات کی دشوار گزار منزلوں میں دیکھنا ہو تو فیضِ میر پڑھیے۔"

میرؔ کو فارسی زبان پر حیرت خیز عبور اور فارسی انشا پردازی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ فیضِ میر کے مقدمے میں میرؔ کی فارسی انشا پردازی کی خصوصیتیں بیان کر کے ان کو مناسب مثالوں سے واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ مثالیں حُسنِ انشا کے وجد آفریں جواہر پارے ہیں۔ میرؔ فلسفۂ الٰہیات کے مسائل جس خوبی اور خوشنمائی سے بیان کرتے ہیں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"لذتِ دریافتنِ چیزے ملائم است والم دریافتنِ چیزے منافیِ آن۔ ہر قوت را از قوت ہا مُدرکاتِ لذت والم است بحسبِ آن قوت۔ چنان کہ لذتِ باصرہ در دیدنِ محبوب ولذتِ سامعہ در سمعِ آوازِ خوب۔ چندان کہ مُدرک عظیم تر لذت قوی تر۔ دگر از اضداد است رنج والم زیاد است۔ چون ہیچ مدرک

شریف تر از ذات و صفاتِ واجب الوجود نیست، پس ہیچ لذتے لذیذ تر از معرفت او نہ باشد۔"

حشرِ اجساد کے بارے میں ایک جوگی کے بیان کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:۔

"در اثبات بعثت و حشر دلائل بسیار است، اما عود نفس بہ ہماں بدن دشوار است۔ مثلت ہُو۔ مثلاً آدمی مُرد و خاکش ہمہ خورد، و پس از روزگار طویل اجزائے ارضی بہ نبات مستحیل۔ نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذائے انسان۔ اگر بعثت بہ حشر برگمارند بہ کدام صورت باز آرند۔"

میر کا اسلوب بیان کتاب کے عام قاریوں کی علمی سطح سے بلند تر ہے۔ اس لیے کتاب کی نفع رسانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے اس کا خلاصہ اردو میں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ خلاصہ کیا ہے کتاب کا آزاد ترجمہ ہے، جس میں کہیں کہیں ایسے فقرے اور جملے چھوڑ دیے گئے ہیں جو صرف تزئین کلام کا فائدہ دیتے ہیں۔

فیض میر کے دوسرے ایڈیشن کی ابتدا میں فہرست مضامین اور اشخاص و مقامات کے ناموں کا اشاریہ اور آخر میں الفاظ و محاورات کی فرہنگ شامل کر دی گئی ہے۔ فرہنگ کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"میر نے اس چھوٹی سی کتاب میں فارسی محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہ محاورے بیشتر ایسے ہیں جو کلاسیکی فارسی میں مستعمل تھے، مگر جدید فارسی میں تقریباً سبھی متروک ہو چکے ہیں...... بعض محاورے اس کتاب میں ایسے ہیں جن کے لغوی اور مرادی معنوں میں بہ ظاہر کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاق کلام پر نظر کر کے ان کے معنی اندازے سے لکھ دیے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر لفظ اور ہر محاورے کے معنی فارسی لغات و محاورات کی مستند اور بعض کمیاب قلمی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔"

ان کتابوں کے نام بھی لکھ دیے گئے ہیں۔

تبصرہ: بقلم مولوی اختر علی تلہری

"ہمیں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے فیض میر مطبوعہ لباس میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ پروفیسر صاحب نے شروع میں ایک بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص دلپذیر رنگ میں فیض میر کے متعلق بہت سی مفید چیزیں اور اس ضمن میں اور دوسرے ضروری امور لکھ دیے ہیں۔"

ماہنامہ ادب، لکھنؤ۔ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

مجالس رنگین

نظامی پریس، لکھنؤ، سنہ ۱۹۲۹ء

سعادت یار خاں رنگینؔ دہلوی نے اپنی سیاحت کے دوران میں مختلف شہروں میں شاعروں اور ادیبوں سے شعر و شاعری کے متعلق جو دلچسپ گفتگوئیں اور ناقدانہ بحثیں کی تھیں، ان کو اپنے احباب، مرزا نعیم بیگ جوآنؔ، سید انشاؔ وغیرہ کی فرمائش سے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

فاضل مرتب کے مقدمے کا ابتدائی حصہ نقل کیا جاتا ہے جس سے کتاب کی نوعیت اور اس کا سببِ تالیف معلوم ہوتا ہے۔

"اس کتاب کے مصنف سعادت یار خاں رنگینؔ سید انشا کے گہرے دوست اور دلی کے مشہور شاعروں میں ہیں۔ دیباچۂ کتاب میں لکھتے ہیں کہ ۱۰ رجب سنہ ۱۲۱۵ھ کو لکھنؤ میں چند اعزا اور احباب کے مجمع میں اپنی اور مختلف شاعروں کی گزشتہ صحبتوں کا ذکر کر رہا تھا اور بیان کر رہا تھا کہ فلاں شہر میں فلاں شخص سے یہ گفتگو ہوئی اور فلاں سے یہ۔ میرے دوست مرزا نعیم بیگ جوآنؔ نے فرمایا کہ اگر اس

تو یہ کو ایک رسالے کی شکل میں لکھ ڈالو تو ایک یادگار باقی رہ جائے گی۔ میر انشاء اللہ خاں نے ان کی تائید کی اور تمام اہل صحبت بھی مصر ہوئے۔ آخر میں ان کی خاطر سے چند مجلسیں لکھیں۔

اس کتاب کا نام سید انشاء اللہ خاں کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اور حق یہ ہو کر مصنف کے نام اور کتاب کے موضوع کے اعتبار سے اس سے بہتر نام ملنا مشکل تھا۔
رنگین کے بارے میں بہت سی باتیں جو کتاب میں لکھی ہوئی تھیں۔ مرتب نے ان کو مناسب ترتیب سے یکجا کر کے ایک مسلسل و مربوط بیان کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ رنگین کی نثر نگاری، شاعری، ریختی گوئی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

رنگین کی سب سے بڑی خصوصیت کا بیان یوں کیا ہے:

"عیوب کلام پر رنگین کی نظر فوراً پڑتی تھی۔ کسی کے کلام پر اعتراض کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر رنگین میں کمال یہ تھا کہ ادھر اعتراض کیا ادھر اصلاح دے کر شعر کو درست کر دیا، یا اس سے بہتر شعر فوراً کہہ دیا۔ وہ اعتراض کرنے میں بڑے بے باک تھے، لیکن بزرگوں کے کلام پر اعتراض کرنا خلاف ادب سمجھتے تھے۔ پھر بھی اگر ضرورت پڑ جاتی تھی تو اعتراض کرنے سے باز نہ رہتے تھے۔ اپنے ہم عصروں کے علاوہ شاہ حاتم، میر سوز، مرزا سودا، میر تقی میر کے کلام پر بھی جا بجا اعتراض کیے ہیں۔"

ان کا ایک اعتراض خاص طور پر قابل ذکر ہے جس سے ان کی بے باکی، زود فہمی اور زود گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک دن اجمیر میں نواب قدرت اللہ خاں نے فارسی کے عظیم شاعر شیخ سعدی کا یہ مطلع پڑھا:-

سرو سیمینا بہ صحرا می روی   نیک بد عہدی کہ بے ما می روی

رنگین نے فوراً اصلاح دے کر اس کو یوں پڑھ دیا:-

سرو سیمینا بہ گلشن می روی   نیک بد عہدی کہ بے من می روی

رنگین نے اصلاح کا سبب نہیں بیان کیا ہے لیکن یہ اس خیال پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ معشوق کو سروِ سیمیں کہہ کر خطاب کیا ہے اور سرو کو جو مناسبت گلشن سے ہے وہ صحرا سے نہیں۔ اس کے علاوہ صحرا نوردی عاشق کا کام ہے معشوق کا نہیں۔

کتاب میں مجلسوں کی تعداد باسٹھ ہے۔ آخری مجلس میں رنگین نے ایک دوست کے دریافت کرنے پر اپنے 'مذکر و مونث' دس شاگردوں کے نام بتائے ہیں اور ان کے بہت سے شعر اپنی یاد سے لکھے ہیں۔

مرتب نے اپنے مقدمے کے آخر میں 'تصنیفات رنگین' کے عنوان سے ان کی تیئیس[۲۳] کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں خود رنگین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی لندن میں انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشخاص اور مقامات کی فہرستیں مجلسوں کے حوالوں کے ساتھ شامل کر دی گئی ہیں۔

رُوحِ انیس

طبعِ اول۔ انڈین پریس، الہ آباد، ۱۹۳۱ء

طبع دوم۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۵۶ء

طبع سوم۔ راجہ رام کمار پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۴ء

طبع چہارم۔ نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

طبع پنجم۔ نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء

طبع اول کے دیباچے سے چند اقتباس نقل کیے جاتے ہیں:۔

"میر انیس کے تمام کلام کو پڑھ کر جو مرثیے، سلام اور رباعیاں بہترین معلوم ہوئیں، ان میں سے سات[۷] مرثیے، پندرہ[۱۵] سلام اور پینتیس[۳۵] رباعیاں ایک جلد کے لیے

منتخب کیں۔ ایک ایک مرثیے کے جتنے جتنے قدیم اور معتبر قلمی نسخے فراہم ہو سکے ان کا باہمی مقابلہ کر کے ہر مرثیے کی تصحیح کی ۔"

"مقدمہ کتاب میں پہلے امام حسینؑ کی شہادت کا مختصر حال لکھا گیا ہے کہ یہی غم ناک اور عظیم الشان واقعہ مرثیے کا موضوع ہے۔ اس کے بعد مرثیے کی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی بتائے گئے ہیں اور ان لوگوں کے ضروری حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں جن کا ذکر مرثیوں میں اکثر آتا ہے۔ اس کے بعد میر انیس کے کچھ حالات زندگی لکھ کر ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔"

"مشکل الفاظ کی فرہنگ اور مشکل مقامات پر حاشیے لکھ کر یہ دونوں چیزیں کتاب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ حاشیوں میں کہیں کہیں کلام کی کسی خاص خوبی یا کسی صنعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔"

طبع اول میں پانچ تصویریں ہیں ، میر انیس کا سہ رنگی بلاک اور میر انیس کی تحریر ، مکان ، مدفن اور ایک مجلس کا بلاک۔ $\frac{20 \times 26}{8}$ سائز پورے کپڑے کی جلد جس پر روضۂ امام حسینؑ کا بلاک چھپا ہوا ہے۔

طبع دوم کے دیباچے کے دو اقتباس قابل لحاظ ہیں :۔

" انتخاب کلام کی مشکل منزل طے کرنے کے بعد اس سے زیادہ دشوار گزار منزل یہ تھی کہ مرثیوں کے قدیم اور مستند نسخے فراہم کر کے ان کے باہمی مقابلے سے کلام کی تصحیح کی جائے۔ اس سلسلے میں کس کس کی ناز برداری کرنا پڑی ، کن کن دروازوں[1] پر بار بار حاضری دینا پڑی اور کتنی کتنی مرتبہ ایک مرثیے کا مقابلہ دوسرے نسخوں

---

[1] ، روح انیس کے مقدمے کا یہ حصہ ' واقعہ کربلا اور اس کے اسباب و نتائج ' کے نام سے علیحدہ ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔

سے کرنا پڑا "

"انیس کے کلام کو بخوبی سمجھنے کے لیے کربلا کے خونیں واقعے کی تفصیلات، اشخاص مرثیہ کے حالات، شاعر کے معتقدات و مسلّمات، جو لوگ اس کے براہِ راست مخاطب تھے ان کے خیالات و جذبات اور مرثیے کے لوازم و خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس غرض سے چند مقدمے کتاب میں شامل کیے جاتے ہیں..... ان کا بغور مطالعہ کرنے سے وہ ذہنی پس منظر کسی حد تک ضرور پیدا ہو سکتا ہے جس کے بغیر مرثیے کی شاعری سے پورا لطف اٹھانا ممکن نہیں۔"

طبع اول میں مشکل الفاظ کی فرہنگ علاحدہ اور مشکل مقامات پر حاشیے علاحدہ لکھ کر کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے تھے۔ طبع دوم میں یہ دونوں چیزیں مخلوط کر کے ذیلی حاشیوں میں درج کر دی گئی ہیں۔ ہر صفحے کے متعلق الفاظ اور حاشیے اسی صفحے پر فٹ نوٹوں کی طرح لکھ دیے گئے ہیں۔ اس تبدیلی کے لیے بڑی محنت کرنا پڑی ہے۔ لیکن اس سے پڑھنے والوں کے لیے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

طبع سوم میں طبع اول کی پینتیس[۳۵] رباعیوں پر پندرہ رباعیوں کا اضافہ کر کے ان کی تعداد پچاس کر دی گئی ہے۔ طبع چہارم میں طبع سوم کی پچاس رباعیوں پر اور بیس رباعیوں کا اضافہ کر کے ان کی تعداد ستّر کر دی گئی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کلامِ انیس کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"شاعری کی ساحری یہ ہے کہ تبصرہ نگار جو مرثیوں کی تاریخیت کا ذرا بھی قائل نہیں، کبھی تو درد و گداز کے موقعے پر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کبھی منظر کشی کے وقت یا شجاعت و سپہ گری کے بیان میں بے اختیار داد و تحسین کے کلمے زبان پر لے آیا۔ اور لطفِ زبان کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ ماہر فن کی چابک دستی عقائد و تاریخ دونوں کے عالم سے ماورا ہوتی ہے۔" (صدق جدید، لکھنؤ، یکم اگست ۱۹۵۸ء)

جابنیہ نامحہ شیدا:-

"میر انیس کی شاعرانہ عظمت کو دیکھتے ہوئے ان پر بہت کم کام ہوا ہے ... تدوین و ترتیب کا کام بھی اطمینان بخش طریقے پر عمل میں نہیں آیا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب نے البتہ کچھ مراثی مرتب کر کے شائع کیے ہیں اور ان پر بڑی محنت اور دقت نظر سے مفید حواشی اور مقدمے لکھے ہیں۔"

(ادب فکر اور سماج - ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۲ء صفحہ ۹)

نظامِ اُردو

مصنف: سید انور حسین آرزو لکھنوی

محشی و مرتبہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب

یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء

اس کتاب میں دو دیباچے ہیں ایک مصنف کا اور ایک محشی کا۔ مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے "کتاب اشاعت سے پہلے مشہور ہو گئی ... یہی شہرت فاضل شارح پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ام۔ اے ادیب سے تعارف کا سبب بنی۔ موصوف کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی نے جہاں کتاب کو مفید عام مانا۔ وہاں اسے لائق شرح بھی جانا بلکہ شرح کی تکلیف بھی خود ہی گوارا فرمائی۔ عام دستور ہے کہ متن کی اشاعت کے بعد اگر ضرورت سمجھی جاتی ہے تو شرح بھی لکھی جاتی ہے۔ مگر اس کتاب کے لیے جس کا موضوع جدید مباحث دقیق بہتر یہی معلوم ہوا کہ کتاب مع شرح شائع ہو۔ چنانچہ تبادلہ خیالات سے جو مصنف و شارح میں ضروری تھا، مفید نتیجے نکلے۔ حصہ اول کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی اور حصہ دوم میں بعض اجمالی بحثوں کی تفصیل ہو گئی۔"

محشی کے دیباچے کا خلاصہ انہی کے لفظوں میں حسب ذیل ہے۔

"یہ چھوٹی سی چند صفحوں کی کتاب ہے، مگر اس کی تصنیف میں مصنف کو اردو زبان کی ساخت اور اس کے اسباب فصاحت پر برسوں غور کرنا پڑا ہے.... ایک ایک قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد بنتا ہے.... مصنف کتاب نے تو بیسیوں قاعدے بنا ڈالے ہیں.... قاعدے بنانے کا ہفت خوان طے کرنے کے بعد جو مصیبت ناک منزل سامنے آتی ہے وہ ان کا بیان کرنا ہے۔ اس کام میں بھی بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، ایک ایک لفظ تولنا ہوتا ہے، اصطلاحیں گڑھنا پڑتی ہیں، لفظوں کا مفہوم معین کرنا ہوتا ہے، مصنف نے اس منزل کو بھی نہایت خوبی سے طے کیا ہے اور ایسی ایسی مفید اصطلاحیں وضع کی ہیں کہ ان سے قواعد زبان سکھانے، اصول فصاحت سمجھانے اور عبارت کے حسن و قبح بیان کرنے میں آئندہ بہت آسانی ہوا کرے گی۔ تیسری مستقل منزل مباحث کی ترتیب تھی، منتشر مطالب کو کسی نظام کے تحت میں لانا بھی آسان نہیں ہے۔ ان منزلوں میں میں بھی مصنف کے ہمراہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنی دفعہ تھوڑا تھوڑا راستہ طے کر کے واپس آنا پڑا۔ کتنی دفعہ پوری پوری مسافت طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سیدھی راہ نہ تھی۔ غرض نہ معلوم کتنی مرتبہ مطالب کو مقدم و موخر کیا، کتنی دفعہ قواعد کی ترتیب بدلی اور کتنی مرتبہ انھیں لفظوں کا جامہ پہنایا جو کبھی ڈھیلا ہو گیا کبھی تنگ۔"

"اردو میں قواعد زبان کی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ان کے مولفوں نے اپنے اکثر فارسی و عربی صرف و نحو کی تقلید کی ہے کسی نے بہت جدت کی تو اردو کے قواعد کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال دیا.... اس کتاب کا موضوع ہے الفاظ بالخصوص مترادفات کا استعمال برمحل۔"

"اردو زبان کے قواعد صرف و نحو اور اصول فصاحت کے انضباط کی طرف سب

سے پہلے سید انشا نے توجہ کی۔ لیکن اصول و قواعد کی پابندی کا خیال عام کر دینے میں تقدم کا شرف حضرت ناسخ کو ہے۔ ناسخ کے جانشین رشک، رشک کے جلال اور جلال کے آرزو ہوئے۔ اس سلسلے کے ہر شخص نے اردو زبان کا مزاج پہچاننے اور اس کو حالت اعتدال پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ زبان کے متعلق مختلف مباحث پر رسالے لکھے، لغت مرتب کیے۔ الفاظ و محاورات کی تحقیق و تصحیح اور اصول فصاحت و بلاغت کے تجسس و تعیین میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے پیشرو کی تحقیق میں اضافہ کیا اور جہاں تک اصول فصاحت کا تعلق ہے اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ناسخ نے جس کام کی ابتدا کی تھی جناب آرزو نے اس کو اختتام تک پہنچا دیا۔

"مصنف نے اس کتاب میں انتہا کا اختصار ملحوظ رکھا ہے ۔۔۔ میں نے حضرت مصنف کی اجازت سے کہیں کہیں توضیحی حاشیے لکھ دیے ہیں۔"

یہ فاضل حاشیہ نگار کا فطری انکسار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حاشیوں کی عبارت کتاب کے متن سے بہت زیادہ ہے۔ بیشتر صفحوں میں متن کی صرف دو تین سطریں ہیں اور پورا صفحہ حاشیوں سے بھرا ہوا ہے۔

جواہر سخن جلد دوم

کائستھ پاٹھ شالا پریس، الہ آباد، ۱۹۳۵ء

جواہر سخن کی پہلی جلد صوبۂ متحدہ کی ہندوستانی اکیڈیمی نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔ اس کے تعارف میں اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ "چھ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد اکیڈیمی جواہر سخن کی پہلی جلد پبلک کے روبرو پیش کرتی ہے۔ اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۲۷ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سربرآوردہ سخن وروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنف سخن پر

حادی ہو۔ اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے یہ کام مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی کے سپرد کیا۔ انھوں نے چھ سال کی کوشش سے یہ انتخاب جواہرِ سخن کے نام سے چھ جلدوں میں مرتب کیا ـــــ

مجلس انتظامیہ نے انتخاب پر نظرِ ثانی کی غرض سے چھ ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی اور ایک ایک جلد ہر رکن کے سپرد ہوئی۔ کمیٹی کے ارکان ترتیب وار یہ حضرات مقرر ہوئے۔ جناب مولانا سید محمد سلیمان ندوی، جناب مولانا سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، جناب نواب جعفر علی خاں اثر، جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، جناب مولانا نعیم الرحمٰن اور جناب مرزا محمد عسکری۔

جواہرِ سخن کی دوسری جلد جو سب سے زیادہ ضخیم ہے اور اردو کے سب سے زیادہ اہم شعرا کے انتخابات پر مشتمل ہے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے۔ "جس پر مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔ اے، شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے نظرِ ثانی کی" اس جلد کے دیباچے میں مسعود حسن صاحب نے لکھا ہے "دوسری جلد پر نظرِ ثانی کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔ نظرِ ثانی کرتے وقت میں نے زیادہ تر حذف و ترمیم سے کام لیا ..... بعض شعرا کے خصوصیات کلام از سرِ نو لکھے۔ کلام کے انتخاب میں بھی زیادہ تر حذف سے کام لیا ..... اس کانٹ چھانٹ کے بعد کتاب کی ضخامت نصف کے قریب رہ گئی، پھر بھی یہ جلد تقریباً ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔"

اس دور کے خصوصیات پر مسعود صاحب نے کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میر کے حالات زندگی بھی خود لکھے ہیں اور اس سلسلے میں لکھا ہے "یہ فخر صرف میر ہی کو حاصل ہے کہ ان کے ہم عصروں سے لے کر آج تک کے اکثر باکمال شعرا نے ان کے کمال کا پرزور لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔" اس قول کے ثبوت میں معتبر شاعروں کے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ قارئین کی دلچسپی کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔

سودا :- سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو "میر" سے استاد کی طرف

مصحفی :- اے "مصحفی" تو اور کہاں شعر کا دعوا
پھبتا ہے یہ انداز سخن "میر" کے منھ پر
غزل اے "مصحفی" یہ "میر" کی ہے
تمھاری میرزائی ہو چکی بس

ناسخ :- شبہ "ناسخ" نہیں کچھ "میر" کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد "میر" نہیں

آتش :- "آتش" بقول حضرت "سودا" شفیق من
ہونا ہے تجھ کو "میر" سے استاد کی طرف

غالب :- غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول "ناسخ"
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد "میر" نہیں
ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو "غالب"
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی "میر" بھی تھا

ذوق :- نہ ہوا پر نہ ہوا "میر" کا انداز نصیب
"ذوق" یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

عیش :- ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں "عیش" فقط
کلام "میر" ہے البتہ دل پذیر اپنا

مجروح :- یوں تو ہیں "مجروح" شاعر سب فصیح
"میر" کی پر خوش بیانی اور ہے

شیفتہ :- نرالی سب سے ہوئی "شیفتہ" اپنی روش لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے "میر" پھرتی ہے

رندؔ :- شیخ "ناسخ" خواجہ "آتش" کے سوا بالفعل "رند"
شاعران ہند میں کہتے ہیں طرز "میر" ہم
تیرا کلام کتنا مشابہ ہے "میر" سے
عاشق ہیں "رند" ہم تو اسی بول چال کے

"عرشؔ" :- لاکھ تقلید کیجئے اے "عرش"
پر کب انداز "میر" آتا ہے

شادؔ لکھنوی :- میں ہوں وہ طوطیٔ ہندوستاں "شاد"
زباں جس کی ہے مثل "میر" اردو

مولوی اسمٰعیل :- یہ سچ ہے کہ "سودا" بھی تھا استاد زمانہ
میری تو مگر "میر" ہی تھا شعر کے فن میں

داغؔ :- "میر" کا رنگ برتنا نہیں آساں لے "داغ"
اپنے دیواں سے ملا دیکھیے دیوان ان کا

جلالؔ لکھنوی :- کہنے کو "جلال" آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخن میر تقی "میر" کی کیا بات

امیرؔ مینائی :- شاعری میں "امیر" کی خاطر
"میر" اپنی زبان چھوڑ گئے

امداد امام اثرؔ :- لیکن "اثر" جو چشم حقیقت سے دیکھئے
کوئی غزل سرا نہ ہوا "میر" کی طرح

اکبرؔ الہ آبادی :- میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں "اکبر"
"ناسخ" و "ذوق" بھی جب چل نہ سکے "میر" کے ساتھ

حسرت موہانی:۔ گزرے بہت استاد مگر رنگ اثر میں
بے مثل ہے "حسرت" سخن "میر" ابھی تک

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن "حسرت"
"میر" کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں

صفی لکھنوی:۔ ابیات غزل میں حسن تاثیر وہی
ہر نغمۂ دلکش میں بم و زیر وہی

"حافظ" کا جو فارسی میں رتبہ ہے "صفی"
اردو میں وہی مرتبہ "میر" وہی

شاہکارِ انیس

نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۳ء

میر انیس کے اُس بے مثال مرثیے کا شاندار مصوّر ایڈیشن، جس کا مطلع ہے:

'جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'

مسعود صاحب کی تجویز پر عمل کرکے لکھنؤ کے نامی خطّاط اور نظامی پریس کے مالک مرزا محمد جواد نے اپنا سارا کمال صرف کرکے شاعری کے اس شاہکار کو کتابت اور طباعت کا بھی شاہکار بنا دیا۔ مشرقی طرز کے بہت رنگین اور سنہرے نقوش سے مزیّن حاشیے کے بیچ میں ہلکے زرد رنگ کی زمین پر روشن سیاہ حرفوں میں فی صفحہ ایک بند لکھا گیا، مرثیے کے اہم واقعات کے رنگین مرقعے کتاب میں مناسب مقامات پر لگائے گئے اور کتاب کے صوری حسن میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔[1] کتاب کا معنوی

[1] اس کتاب کی طباعت، اشاعت نقاشی اور تصویر کشی اور تصویروں کے رنگین بلاکوں کی چھپائی پر کثیر رقم صرف ہوتی تھی۔ اس کی مناسبت سے اشاعت کی قیمت بہتر روپے مقرر کی اور قدرشناسوں نے انیس کا یہ ایک مرثیہ اس قیمت پر بخوشی خریدا۔

حسن ادیب کی جودت فکر، حسن بیان اور سلیقۂ ترتیب کا ثمرہ ہے۔ موصوف نے کتاب کے شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ اور آخر میں بے شمار توضیحی اور تنقیدی حاشیے لکھے ہیں۔ مقدمۂ کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی تعبیریں ہو سکتی ہیں، انیس کے مرثیے ان سب پر حاوی ہیں۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیر ہو یا حیات کی، تخئیل کی جولانگاہ ہو یا محاکات، اس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکون قلب کی تحصیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ، مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیئے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان سب کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجے کی شاعری میں ہوگا۔ ایسی جامع صنف سخن انیسی مرثیے کے سوا اور کون ہے ۔"

مقدمۂ کتاب میں اس مرثیے کا جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ نفسیاتی بصیرت، تنقیدی شعور اور حسن بیان کا ایک نادر مرقع ہے۔ چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

صبح کا منظر

"پیش نظر مرثیے میں صبح کا منظر جو آنا دل کش دکھایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی صبح ہے جن کے لیے بقول انیس 'گزری شب فراق دن آیا وصال کا' اور جنھوں نے 'راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے' یہ وہ صبح ہے کہ خوشی کے مارے امام حسین کی حالت اس مصرعے کی مصداق ہے 'چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا' اور انصار حسین کا یہ عالم ہے کہ 'لب پہ ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو'۔ اب صبح کے اس منظر کو اس نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے ۔"

گرمی کی شدّت کا بیان

" انیسؔ نے گرمی کی شدت کا بیان اس قدر طولانی اور اتنا مبالغہ آمیز کسی دوسری جگہ نہیں لکھا ہے۔ اس بیان میں جو مبالغہ کیا گیا ہے وہ جابجا غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باکمال شاعر نے مبالغے کے ساتھ اصلیت کی آمیزش اس ہوشیاری سے کر دی ہے اور دونوں کو اس طرح دوش بدوش لے چلا ہے کہ گرمی کی شدت کا حقیقی احساس قدم قدم پر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حسنِ بیان، ندرت تشبیہات، جدت استعارات، حسن تعلیل وغیرہ اتنی خوبیاں اس بیان میں بھر دی ہیں کہ سامعین پر ایک حیرت سی طاری ہو جاتی ہے اور ان کو مبالغے اور اصلیت میں امتیاز کرنے کا ہوش نہیں رہتا ۔"

گھوڑے کی تعریف

" صبح کے وقت جب امام حسینؑ اپنے عزیزوں اور رفیقوں کے ساتھ میدان شہادت کی طرف تشریف لیے جا رہے تھے تو ایک مسرت اور شگفتگی کا عالم تھا اور عقیدت اور محبت کی آنکھیں آپ کی سواری کی شان دیکھ رہی تھیں۔ اس حالت میں شاعر نے آپکے گھوڑے کی تعریف یوں کی ہے:۔

سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے ۔۔۔ گھونگھٹ نئی دلھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

ظہر کے وقت فضا بالکل بدل چکی ہے۔ امام حسینؑ جہاد کے ارادے سے سوار ہو رہے ہیں، چاروں طرف وہ مجمع ہے جو امام کو ایک زبردست حریف اور بہادر سپاہی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس موقعے پر شاعر اسی گھوڑے کی تعریف یوں کرتا ہے:۔

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار ۔۔۔ جرار، بردبار، سبک رو، وفا شعار

شاعر نے دو مختلف حالتوں کی مناسبت سے ایک ہی گھوڑے کی دو مختلف تصویریں کھینچی ہیں۔ شاعرانہ مصوری اسی کا نام ہے اور انتخاب شاعرانہ اسی کو کہتے ہیں ۔"

ندائے غیب یا دل کی آواز

"امام حسین کی جنگ کے تفصیلی بیان کے بعد:

آئی ندائے غیب کہ شبیرؑ مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

یہ ندائے غیب جو صرف امام حسین کے کانوں میں پہنچی، کوئی بیرونی آواز نہیں ہے۔ یہ اُس مطمئن دل کی آواز ہے جس کو احساس ہے کہ میں نے حق کی حمایت میں وہ جہاد کیا ہے جیسا نہ کبھی کسی نے کیا اور نہ کوئی کر سکے گا۔ یہ جہاد صرف ایک تن تنہا کا ایک کثیر التعداد لشکر سے مقابلہ نہ تھا، بلکہ ان تمام فطری اور انسانی کمزوریوں سے مقابلہ تھا جو حق پر قائم رہنے میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ یہ بھوک سے مقابلہ تھا، پیاس سے مقابلہ تھا، عزیزوں اور دوستوں کی محبت سے مقابلہ تھا، مخدراتِ عصمت کے حفظ ناموس کی خواہش سے مقابلہ تھا، شدید ترین جسمانی تکلیفوں سے مقابلہ تھا، موت کے خوف سے مقابلہ تھا۔ یہ ندائے غیب ان تمام زبردست حریفوں سے مقابلے میں کامیاب رہنے والے مجاہد کے مطمئن دل کی آواز ہے۔ اس کے دل کی آواز ہے جو محسوس کر رہا ہے کہ اس جہاد راہِ خدا کے باعث مجھے کائنات پر فتح حاصل ہو گئی ہے، سارے عالم کے دل پر میری حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اب کوئی چیز باقی نہیں ہے جس سے جنگ کرنا ضروری ہو، جہاد کی تمام منزلیں طے ہو چکیں۔ انیس نے اس مصرعے میں "بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر" ایک اور لطیف نکتہ رکھا ہے۔ وہ جس مذہبی عقیدے کے پیرو تھے اس کی رو سے امام حسین کا یہ جہاد آخری اسلامی جہاد تھا۔ اس کے بعد کوئی جہاد نہ ہوا ہے نہ امام عصر کے ظہور تک ہو سکتا ہے۔"

مراثی انیس میں اخلاقی تعلیم

"معرکہ کربلا صرف حسین اور یزید کی جنگ نہیں ہے، حق اور باطل، نیکی اور بدی،

انسانیت اور بہیمیت کی جنگ ہے۔ بلکہ حق کی حمایت اور انسانیت کی حفاظت کے لیے انسان کی سب سے بڑی قربانی ہے۔ انیس نے اس قربانی کی توضیح اور اس کی قدر و قیمت کی تشریح جس خوبی سے کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے فلسفیانہ بحثیں کر کے صرف ترقی یافتہ دماغوں کے اطمینان کا سامان بہم نہیں پہنچایا ہے، بلکہ انسانی کرداروں کے بولتے چالتے مرقعے پیش کر کے دلوں کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ معمولی فہم کے انسان بھی انیس کی تعلیم سے بلا ارادہ اور بغیر خواہش و کوشش کے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انسانیت کے بلند ترین معیار کو پیش نظر رکھ کر جس پر اثر اور عملی طریقے سے میر انیس کے مرثیے نیکیوں کی تعلیم دیتے ہیں، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ...... شریف ترین جذبات کی تحریک میں کوئی دوسری تصنیف انیس کے مرثیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انیس کے مرثیے ہم کو ایسی فضا میں پہنچا دیتے ہیں جو تمام تر نیکی ہے اور نیکی کی طرف مائل کرنے والی، اور زندگی کے تصور میں وہ رفعت پیدا کر دیتے ہیں جو کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔"

مراثی انیس کے لیے معیار تنقید

"دنیا کے مسلمہ معیار شاعری کے اعتبار سے ایپک اور ٹریجڈی یعنی رزمیہ شاعری اور حزنیہ تمثیل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اردو ادب کا خزانہ ان بیش بہا گوہروں سے خالی تھا..... انیس نے رزم کے بیان پر بہت زور دیا، اجتماعی اور انفرادی جنگوں کے تفصیلی منظر بڑی خوبی سے پیش کیے، اور رزمیہ شاعری کی تقریباً تمام شرطیں پوری کر دیں۔ اس کے ساتھ ٹریجڈی یا حزنیہ تمثیل کے اہم عناصر کو بھی مرثیے میں داخل کر دیا۔ اور اپنے مخصوص طرز خوانندگی سے مرثیے میں ڈراما کی شان پیدا کر دی۔ اس طرح انیس مرثیہ ایپک اور ٹریجڈی کا ایک ایسا مجموعہ بن گیا جس کی مثال شاید دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔ اسی بنا پر انیس کے مرثیوں پر تنقید کرتے وقت ایک طرف بیانیہ، رزمیہ، ڈرامائی اور جذباتی شاعری کے عالمگیر اصول پیش نظر رکھنا چاہییں، دوسری طرف مرثیے کی مخصوص ہیئت، مخصوص موضوع

اور مخصوص مقصد کے لحاظ سے اس کی تنقید کے لیے ایک مخصوص معیار ہونا چاہیئے۔ یہ مخصوص معیار انیس کے مرثیوں کے گہرے مطالعے ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔"

اردو زبان اور اس کا رسم خط

بار اول ادبی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۰ء

بار دوم نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

مصنف کے پیش نامے کے چند اقتباسات قابل لحاظ ہیں۔

"آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا تیرھواں اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ناگپور میں ہوا تھا۔ کانفرنس کے اس اجلاس میں مشرقی علوم کے سولہ شعبے تھے۔ جن میں ایک شعبہ اردو کا بھی تھا۔ اس شعبے کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ میں نے ۲۱ اکتوبر کو پڑھا تھا وہ اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔"

"ہمارے صوبے کی حکومت نے سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا ہے اور اردو زبان اور فارسی حرفوں کو کچہریوں، دفتروں اور تمام سرکاری کاروبار سے بالکل خارج کر دیا ہے۔"

"ہندی کے سرکاری زبان قرار پا جانے سے اس کی تحصیل ہر شخص کے لیے ناگزیر ہو گئی ہے اور اس کو اس صوبے کے نظام تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت دینا درست ہے۔ لیکن اس سے اس صوبے کی دوسری وسیع اور سرمایہ دار زبان اردو کے ساتھ ناانصافی کرنے کا جواز نہیں نکلتا۔"

"اردو اقلیت کی زبان سہی، مگر اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہی تو وہ معیار ہے جس سے کسی جمہوری حکومت کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اقلیت کے حقوق کا پامال کرنا کسی حکومت کے لیے نہ کوئی دشوار کام ہے، نہ کوئی قابل فخر کارنامہ۔ اس صوبے کے باشندو

کی ڈیڑھ سو برس کی مسلسل کوششوں سے اردو جس بلند مقام پر پہنچ چکی ہے اس سے نیچے گرانے کے لیے اس وقت اس پر ایسے ایسے الزام لگائے جا رہے ہیں جو کبھی کسی کے وہم میں بھی نہ آئے تھے اور جن کو سن کر یہ مشہور مصرع یاد آجاتا ہے:۔

"قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے"

اس کتاب پر جو تبصرے شائع ہوئے وہ اس کی نوعیت اور اہمیت کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں اس لیے انھیں کو پیش کر دینا کافی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

"اردو کے خلاف جب سے یلغار شروع ہوئی ہے، چھوٹے بڑے متعدد رسالے اور مقالے اردو کی صحیح منزل اور مرتبے کی توضیح پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب میں بہت ہی ممتاز اور بہت ہی بلند درجہ اس رسالے کو حاصل ہے۔ ... اپنے بحث پر یہ ٹھوس پُر مغز اور اطراف و جوانب پر حاوی ایک مستقل تصنیف ہے اور مصنف کا کمال یہ ہے کہ سارے بحثوں کو ۸۰ مختصر صفحات کے اندر سلیس و شگفتہ عبارت اور دلکش انداز میں سمیٹ لیا ہے۔ بحث زبان اور رسم خط دونوں پر ہے اور ... ہر بحث اپنی جگہ پر سنجیدہ و مدلل و مکمل ... ضرورت اس کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے بلکہ ممکن ہو تو اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی ضرور شائع کیے جائیں۔ غیر اردو دانوں میں آخر کچھ تو منصف مزاج اور تحقیق پسند ہوں گے، دشوار ہے کہ وہ اس کے دلائل سے غیر متاثر رہیں۔"

(اخبار صدق جدید، لکھنؤ ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء)

"صدارتی خطبوں میں سے اکثر کی حیثیت مقامی اور وقتی ہوتا ہے۔ لیکن یہ خطبہ ان معدودے چند خطبوں میں سے ہے جو وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر ہو کر اپنے لیے ایک مستقل اور دوامی مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ ... رسالے کے پہلے حصے میں اردو زبان، اس کی تاریخ، اس کے ترکیبی عناصر، اس کی تمدنی اور قومی اہمیت، اس کی صوتی خصوصیات

پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ دوسرے حصّے میں رسم خط اور اس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل کی فاضلانہ، غیر جانبدارانہ اور منطقی بحث ہے۔۔۔۔۔ اردو کے متعلق کچھ لکھتے وقت عموماً یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں موجودہ حالات کی تلخی لکھنے والے کے تصورات میں جذباتی ہیجان اور بیان میں غیر منطقی جوش نہ پیدا کر دے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔"

(رسالہ ماہ نو، کراچی، مارچ ۱۹۴۹ء)

"اس وقت جب کہ یو، پی میں سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا جا چکا ہے۔۔۔۔۔ اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے رسم الخط کو ناقص اور غیر ملکی قرار دیا جا رہا ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے یہ رسالہ لکھ کر ایک اتنی بڑی ادبی خدمت اور وقت کی ایک ایسی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے کہ دنیائے ادب میں ان کے اس کارنامے کو سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔۔۔۔۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں "تاریخ کی روشنی" میں نہایت ہی فاضلانہ انداز میں علمی اور عقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندوستان کی قومی زبان بننے کی جملہ صلاحیتیں موجود ہیں۔

دوسرا حصّہ جو اردو کے موجودہ رسم الخط کے جواز میں ہے، وہ پہلے حصے سے کہیں زیادہ مدلّل، پرمغز اور علمی ہے اور اس میں فاضل مصنف نے اس بات کو عقلی اور نقلی تمام دلائل اور براہین سے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ اردو رسم الخط کو ناقص بتانے والے یا تو محض تعصب کا شکار ہیں یا دنیا کی دوسری زبانوں کے رسم الخط سے ان کی واقفیت محدود ہے۔

یہ کتاب نہ صرف ہر لائبریری، ہر کتب خانے اور ہر اردو دوست ہی کے پاس ہونا ضروری ہے بلکہ موجودہ دور میں جبکہ ملک میں ایک قومی اور مشترک زبان بنانے کا مسئلہ

درپیش ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں سبھوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد وہ صحیح رائے قائم کرسکیں۔"

(صداقت، کانپور، ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء)

"اردو دشمنوں کا مخالفانہ پروپگنڈہ زور شور سے جاری ہے۔ اس رسالے کا مطالعہ .... اس باطل پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کر دے گا اور اردو کے حامیوں کو اردو کی تائید کے قوی اور موثر دلائل ہاتھ آجائیں گے۔"

(اخبار تنویر، لکھنؤ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

ڈاکٹر عبدالستار دلوی ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی اردو و لسانیات ناظم مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، بمبئی نے اپنی کتاب "اردو میں لسانیاتی تحقیق"، مطبوعہ آج پریس بمبئی، مئی ۱۹۷۱ء میں اردو رسم خط کی علمی حیثیت کے عنوان سے مسعود صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کا دوسرا حصہ (از صفحہ ۵۱ تا ۸۶) نقل کر دیا ہے۔

متفرقات غالب

مرزا غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات و منظومات

طبع اول (ٹائپ) ہندوستان پریس، رام پور ۱۹۴۷ء

طبع دوم (لیتھو) نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۹ء

ادیب کا ایک مضمون "مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شان نزول" رسالہ الناظر لکھنؤ بابتہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں اور ایک مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی" رسالہ زمانہ کانپور بابتہ مارچ و اپریل ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ دو مضمون پیش نظر کتاب کی بنیاد بن گئے۔ کتاب کے مطالب کا بیشتر حصہ ادیب کے کتب خانے کی ایک نادر قلمی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس بیاض میں غالب کے اڑتالیس ۴۸ فارسی خط ہیں۔

اکیس[21] خط مولوی سراج الدین احمد کے نام، چھ خط مرزا احمد بیگ خاں طپاں کے نام، بیس خط مرزا ابو القاسم خاں قاسم کے نام اور ایک خط ادارہ جام جہاں نما کے نام ہے۔ خطوں کے علاوہ قاسم کا ایک فارسی قطعہ غالب کے نام، غالب کے دو فارسی قطعے اس قطعے کے جواب میں، غالب کی ایک فارسی مثنوی اور ایک مدحیہ اردو غزل بھی اس بیاض میں موجود ہے۔ یہ کل خط جن لوگوں کے نام ہیں وہ کلکتے میں مقیم تھے اور یہ سب نظمیں غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں۔

متفرقات غالب میں اس بیاض کے مندرجات کے علاوہ غالب کا ایک نہایت اہم فارسی خط ناسخ کے خط کے جواب میں، ایک فارسی مثنوی بہادر شاہ ظفر کے نام سے، ایک اردو سلام اور ایک اردو خط ولایت عزیز صفی پوری کے نام، ناطق مکرانی کا ایک خط غالب کے نام، غالب کی مثنوی کے جواب میں دوست علی خلیل کی مثنوی کا ابتدائی حصہ اور غالب سے اصلاح لینے کا حال ولایت عزیز صفی پوری کے قلم سے ہے۔

غالب کی فارسی مثنوی جو اس بیاض میں درج کی گئی ہے وہ بہت کچھ حذف و اضافہ، تغیر و تبدل کے ساتھ غالب کے کلیات نظم فارسی میں باد مخالف کے نام سے شامل ہے۔ اس مثنوی کا سبب تصنیف یہ ہوا کہ کلکتے کے ایک مشاعرے میں غالب نے جو غزل پڑھی اس کے ایک شعر پر اعتراض کیا گیا اور معترض نے اپنی تائید میں قتیل کا قول پیش کیا۔ غالب نے اعتراض کے جواب میں قتیل کا ذکر تحقیر کے ساتھ کیا۔ قتیل کے عقیدت مند نے غالب کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا۔ اس موقع پر غالب نے یہ مثنوی لکھی جس میں مخالفین کی تالیف قلب کے لیے قتیل کی تعریف بھی کر دی۔ مگر تعریف میں اتنا مبالغہ کیا کہ وہ ہجو ملیح بن گئی۔

ادیب نے بیاض اور کلیات میں مثنوی کی دونوں صورتوں کا مقابلہ کر کے پیش نظر کتاب میں اس کی کتابت میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس کی ابتدائی صورت کے ساتھ

ساتھ وہ صورت بھی سامنے آجاتی ہے جس میں اس کو نظر ثانی کے بعد غالب نے اپنے کلیات
میں درج کیا ہے۔ اس مثنوی کو کتاب میں درج کرنے سے پہلے کتابت کے اس طریقے
کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

غالب نے بہادر شاہ ظفر کے نام سے جو مثنوی کہی تھی اس کا بیان بڑی تفصیل
کے ساتھ حالی نے یادگار غالب میں کیا ہے۔ حالی کے اس بیان میں دو نمایاں غلطیاں
تھیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر شاہ کا
بھتیجا بتایا ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ غالب کی مثنوی کا نام دمغ الباطل قرار دیا ہے۔
ادیب نے ان دونوں غلطیوں کی تصحیح کر کے حقیقت یہ بتائی ہے کہ حیدر شکوہ سلیمان شکوہ
کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ان کے فرزند مرزا کام بخش کے بیٹے یعنی سلیمان شکوہ کے پوتے تھے۔
اور اکبر شاہ سلیمان شکوہ کے بڑے بھائی تھے۔ اس طرح حیدر شکوہ سلیمان شکوہ کے بھتیجے
نہیں بلکہ پوتے ہوتے تھے۔ اور اکبر شاہ کے فرزند بہادر شاہ ظفر حیدر شکوہ کے چچا ہوتے
تھے۔ دمغ الباطل امام بخش صہبائی کی مثنوی کا نام تھا۔ غالب کی اس مثنوی کا غالباً
کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔

غالب کی اس مثنوی کے سلسلے میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر
کا بھیجا ہوا ایک سونے کا علم لکھنؤ میں حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھایا گیا، مگر بعد کو بہادر
شاہ ظفر نے علم بھیجنے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ ایک طویل قضیے کی بنیاد بن گیا۔ غالب نے
اس موضوع پر بہادر شاہ کے نام سے ایک مثنوی کہی۔ اس مثنوی کے جواب اور جواب الجواب
میں خلیل شاگرد آتش کی مثنوی شیعیان علی در رد "مثنوی جعلی دہلی"، امام بخش صہبائی کی مثنوی
دمغ الباطل مفتی محمد عباس کی مثنوی خطاب فاصل اور مرزا حیدر شکوہ کی مثنوی شوکت
حیدری ایک کے بعد ایک کہی اور شائع کی گئیں۔ غالب کی مثنوی کا لہجہ تند تھا، جوابی
مثنویوں کا لہجہ تند تر ہوتا گیا۔

مرزا حیدر شکوہ نے علم کا قضیہ ایک رسالے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جو رسالۂ علم حیدری و رعقاید سلاطین تیموری کے نام سے شائع ہوا۔ اس رسالے میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے۔ اور اس دعوے کے کچھ ثبوت بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مذکورۂ بالا مثنویاں اور یہ رسالہ جناب ادیب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ

طبع اول۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۵۳ء

ماخذوں کی تعداد ۳۳

طبع دوم۔ اضافۂ مطالب کے ساتھ، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۴ء

ماخذوں کی تعداد ۰۷ + ۳ = ۴۷

حضرتِ آزاد کی مشہور کتاب آبِ حیات ایک مدت سے اعتراضوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے اس تنقیدی مطالعے میں مستند ماخذوں کے حوالے سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ بیشتر اعتراضات معترضوں کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہیں۔

آزاد کی کتاب، فیضِ میر مرتبۂ ادیب کے مقدمے کے ابتدائی حصے جو آبِ حیات سے متعلق ہیں، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:-

"اردو انشا پردازی کے صدرِ مجلس اور ادبی و لسانی تحقیق کے خضرِ طریقت حضرتِ آزاد مغفور نے اپنی غیر فانی کتاب آبِ حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ اور ان کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ ان کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا

کردی ہے جس نے آزاد پر جا بے جا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہو۔"

"آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی ہے اور پھیلائی جارہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہو کر جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے، اُس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں۔ لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔"

پیشِ نظر کتاب کا سببِ تالیف

"بعض ذی علم اور نامور بزرگوں کی غیر تحقیقی تحریروں اور غیر محتاط رایوں سے متاثر ہو کر ایسے نو خیز لکھنے والے جو علمی استعداد اور معلومات کی وسعت کے اعتبار سے آزاد کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے، اس محقق علام کے منہ آنے لگے اور اس پر اعتراض کر کر کے گویا چاند پر خاک ڈالنے لگے۔ ان سب اعتراضوں کا جائزہ لیا جائے تو آبِ حیات سے زیادہ ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ اس لیے آیئے مثال کے طور پر چند اعتراضوں کو لیں اور دیکھیں کہ آزاد کے جن بیانوں سے وہ متعلق ہیں، وہ تحقیق پر مبنی ہیں یا نہیں۔" (تنقیدی مطالعہ صفحہ ۲۳)

آزاد کی غلطیوں کی نوعیت :۔

"حضرت آزاد کے یہاں بھی غلطیاں ہیں۔ مگر وہ غلطیاں ایسی ہیں جیسی ایک محقق ہی سے ہو سکتی ہیں اور جن کی بنا تحقیق ہی پر ہے۔ تحقیق میں غلطی ہو جانا اور چیز ہے اور بلا تحقیق کچھ لکھ مارنا اور چیز ہے۔ ان ناگزیر غلطیوں کی بنا پر کسی کتاب کو کلیتہً پایۂ اعتبار سے ساقط کر دینا اور اس کے مصنف کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیر دینا بے دردی بھی ہے اور جہالت بھی۔" (تنقیدی مطالعہ صفحہ ۲۳)

مصنف نے دس اہم اعتراضوں سے تفصیلی بحث کرنے کے بعد ایک عنوان قائم کیا ہے "مولوی شیروانی کے اعتراضات" اور اس عنوان کے تحت میں لکھا ہے :-

"میر کے تذکرے نکات الشعرا کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اردو نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس مقدمے میں جگہ جگہ مولوی صاحب کے ایسے اقوال ملتے ہیں، جن میں آزاد کی غلط بیانیاں کنایۃً یا صراحۃً دکھائی گئی ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک ایک قول نقل کر کے اس پر تحقیق کی روشنی ڈالی جائے گی۔"

(تنقیدی مطالعہ ص ۹۷)

مولوی صاحب کے بے بنیاد اعتراضوں سے کتاب کے پچاس صفحوں (۹۷ - ۱۲۹) میں تفصیلی بحث کر کے لکھا ہے :-

"اس تفصیلی بحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ آزاد نے نکات الشعرا کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ قیاسی طوطے مینا نہیں ہیں بلکہ ناقابلِ انکار حقیقتیں ہیں۔"

(تنقیدی مطالعہ ص ۱۲۹)

"خیالی طوطے مینا بنانے کا خیال ہر ایسے شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، جو آب حیات کے ماخذوں سے بے خبر ہو۔ نکات الشعرا کے بارے میں آزاد کی جو باتیں بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں، وہ سب حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرے مجموعۂ نغز میں موجود ہیں۔"

(تنقیدی مطالعہ ص ۱۲۹)

قاسم پر بھی غلط بیانی اور دروغ بافی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی دلیل یہ ہو کہ :-

"قاسم کے سامنے نکات الشعرا کا جو نسخہ تھا وہ اس نسخے سے مختلف تھا، جس کو انجمن ترقی اردو نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہو۔ یہ اصل تذکرہ اپنی ابتدائی شکل میں نہیں ہے بلکہ ترمیم و تنسیخ، حذف و تلخیص کے بعد

اس کی وہ صورت ہو گئی ہے جو مطبوعہ نسخے میں نظر آتی ہے۔"

(تنقیدی مطالعہ ص ۱۳۰)

اس دعوے کو مضبوط دلیلوں سے ثابت کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"ان سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ نکات الشعرا کا مطبوعہ نسخہ اس کی ابتدائی صورت سے مختلف ہے۔" (تنقیدی مطالعہ ص ۱۳۶)

"قاسم میر کا ہم وطن اور ہم عصر تھا۔ وہ میر کے حالات کا ذاتی علم رکھتا تھا اور بعض واقعات کا عینی شاہد تھا۔ وہ میر کے شاعرانہ کمال کا معترف تھا۔ اس نے اپنا تذکرہ میر کی زندگی میں لکھا تھا اور کسی نے اس کے بیانوں کی تردید نہیں کی تھی۔ ان حالات میں آزاد مجموعہ نغز کے مندرجات پر اعتماد کرنے میں حق بجانب ہیں۔" (تنقیدی مطالعہ ص ۱۳۹)

میر کا ایک فقرہ اور کئی نامور ادیبوں کا ایک غلط فہمی پر اتفاق

کتاب میں ایک عنوان ہے "تذکرہ خاکسار کا نام"۔ اس نام کے بارے میں کئی ذی علم، نکتہ رس ادیبوں کا ایک غلط فہمی میں متفق ہو جانا ایک عجیب اور دلچسپ بات ہے.... نکات الشعرا میں میر نے خاکسار کے بارے میں لکھا ہے "تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خود" سوال یہ ہے کہ اس سے میر کا کیا مطلب ہے۔

"اس سلسلے میں مولوی عبدالحق، مولوی عرشی اور ڈاکٹر عبداللہ کے حسب ذیل اقوال قابل لحاظ ہیں۔

مولوی عبدالحق:۔ "خاکسار نے ۱۱۶۵ھ میں 'معشوق چہل سالۂ خود' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔" (مقدمۂ نکات الشعرا طبع ثانی ۱۹۳۵ء ص)

مولوی عرشی:۔ "۱۱۶۵ھ کے آخر تک خاکسار کا معشوق چہل سالۂ خود، میر کا نکات الشعرا اور گردیزی کا تذکرہ ریختہ گویاں مرتب ہو چکے تھے۔"

(دیباچہ دستور الفصاحت صفحہ ۵۵)

ڈاکٹر عبداللہ: "معشوق چہل سالۂ خود نوشتۂ خاکسار" — "تذکرۂ خاکسار یا معشوق چہل سالۂ خود" (شعرائے اردو کے تذکرے صفحہ ۱۵ و ۳۵)

ان قولوں سے ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق، مولوی عرشی اور ڈاکٹر عبداللہ کے نزدیک خاکسار کے تذکرے کا نام 'معشوق چہل سالۂ خود' تھا۔ تعجب ہے کہ تینوں صاحب تحقیق ادیبوں نے "بنام معشوق چہل سالۂ خود" کے ایک ہی معنی سمجھ لیے، جو غلط بھی ہیں اور خلاف قیاس بھی۔ بھلا کوئی صاحب عقل و شعور تذکرۂ شعرا کا نام 'معشوق چہل سالۂ خود' رکھنا پسند کرے گا! آخر کتاب کے موضوع اور نام میں کچھ تو مناسبت ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر اسلم فرخی کو بھی تذکرۂ خاکسار کے متعلق یہی غلط فہمی ہوئی ہے، جیسا کہ ان کی اس عبارت سے ظاہر ہے۔

"تذکرۂ سید امام الدین خان، تذکرۂ خان آرزو، تذکرۂ سودا اور معشوق چہل سالہ خود نوشتۂ خاکسار کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ نکات سے پہلے مرتب ہوئے تھے۔" (محمد حسین آزاد جلد دوم صفحہ ۲۹)

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی نکات الشعرا سے قبل کے تذکروں میں "تذکرۂ خاکسار بعنوان معشوق چہل سالہ" کو شمار کیا ہے۔ (ادب کا تنقیدی مطالعہ چوتھا ایڈیشن ۱۹۷۲ء صفحہ ۵۷۱)

ادیب نے میر کے اس فقرے کا صحیح مفہوم یہ بتایا ہے:

"خاکسار نے ایک تذکرہ اپنے چہل سالہ معشوق کے نام سے لکھا، یعنی تذکرہ لکھا خود اور نام ڈال دیا اپنے معشوق کا۔"

خاکسار کی امرد پرستی کا ذکر کرنے کے بعد زیر بحث فقرے کی شرح یوں کی ہے:

"خاکسار نے تذکرہ کسی ایسے شخص کے نام سے لکھا جو کبھی اس کا منظور نظر رہ چکا تھا اور

اب اُس کا سِن زیادہ ہو گیا تھا۔ میر کا اس کو چہل سالہ کہنا بظاہر طنز ہے نہ کہ حقیقت۔"
آبِ حیات کا تحقیقی مرتبہ نمایاں کرنے کے لیے اس کے ستّاون ماخذوں کے نام بتانے کے
بعد لکھا ہے:-

"ان کتابوں سے زیادہ تعداد ان دیوانوں، مثنویوں وغیرہ کی ہے جن کا آبِ
حیات کی تصنیف کے سلسلے میں مصنف کو گہرا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ ان کتابوں میں
بعض ایسی ہیں جو اب نایاب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو چھپ کر عام ہو گئی
ہیں، مگر آزاد کے زمانے میں غیر مطبوعہ اور کمیاب تھیں۔
حقیقت یہ ہے کہ جس محنت اور عمیق تحقیق سے آبِ حیات لکھی گئی ہے اس کی
مثالیں اردو کے کتابی ذخیرے میں بہت کم ہیں۔"

تبصرے

ڈاکٹر عبادت بریلوی:-

"تحقیقی کاوش اور تنقیدی غور و فکر ۔ ۔ ۔ کا بڑا متوازن امتزاج اس کتاب میں
ملتا ہے۔ اس کی روشنی میں آبِ حیات کے صحیح خط و خال ہمارے سامنے آتے ہیں اور
جو غلط فہمیاں آزاد کی اس اہم کتاب کے بارے میں پیدا ہوتی رہی ہیں ان کا ازالہ
ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی ہی اہمیت رکھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب سے
بعض بالکل نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب تنقیدی سے زیادہ تحقیقی ہے۔"
(ریڈیو پاکستان، لاہور، ۲ مارچ ۱۹۵۳ء)

مظفر علی سیّد:-

"اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف سطحی اعتراضات کرنے والوں کو سنجیدگی سے جواب
دیے ہیں، بلکہ آبِ حیات اور اس کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ
خراجِ تحسین ادا کیا ہے جو ہم پر کوئی اسّی سال سے قرض تھا ۔ ۔ ۔ ۔ جدید افسانی

اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی، مولوی عبد الحی مصنف گل رعنا، فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کر دی۔"

(اردو ادب اور تحقیق - نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۱ء)

علی جواد زیدی:-

"تحقیق و تنقید کے میدان میں انھیں اکثر ادبی مناظروں وغیرہ سے بھی سابقہ پڑا ہے۔ آئینۂ سخن فہمی اور آب حیات کا تنقیدی مطالعہ اسی ضمن کی تصنیفیں ہیں۔ مناظرے ادبی ہوں یا تحقیقی، تحقیق خالص سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ اور ان کتابوں کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔" (آجکل، دہلی، اردو تحقیق نمبر، اگست ۱۹۶۷ء)

صفدر آہ:-

"یہ کتاب تو ازن تحقیق اور صفائی استدلال کا نادر نمونہ ہے۔ اس کے دو اڈیشن نکل چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی مخالف آزاد کی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ اس کی ایک دلیل کو بھی رد کر سکے۔" (میر اور میریات ص ۱۵۶)

انتباہ:- آب حیات پر تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ سید سجاد نے مرتب کر کے آب حیات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ" کے نام سے لاہور سے شائع کیا۔ اس کتاب پر عظمت انصاری کا تبصرہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۶ اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ جس میں ترتیب کتاب کی خامیاں دکھائی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں مسعود حسن رضوی کی کتاب آب حیات کا تنقیدی مطالعہ شامل کر لی گئی ہے اور کہیں یہ اعتراف نہیں کیا گیا ہو کہ ادارۂ کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ اس کو ۱۹۵۲ء میں کتابی صورت میں شایع کر چکا ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی:-

"عام طور سے آزاد پر اس طرح کے اعتراضات عائد کیے گئے ہیں۔ انھوں نے

ولی کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ مرزا مظہر کی حسن پسندی کو مبالغہ آمیز طریقے پر بیان کیا ہے۔ سید انشا کے جنون کو بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ ذوق کو غالب سے بڑھا دیا ہے۔ ظفر کے کلام کو ذوق کا عطیہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح کے دیگر الزامات بھی ان پر لگائے گئے ہیں۔

"پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" میں یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا آزاد پر یہ سارے الزامات بے بنیاد ہیں۔ مثلاً مرزا مظہر جان جاناں کی حسن پرستی پر مولانا آزاد نے روشنی ڈالی ہے۔ مگر کچھ لوگوں کا قول ہے کہ یہ بڑا الزام ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا قول ہے کہ خلیفہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی نے "معمولات مظہری" میں مرزا مظہر کی حسن پرستی کے بارے میں لکھا ہے:

"از حالت صبا و شیر خوارگی انوار عشق۔ از جبین مبین ایشاں ظاہر و ہویدا بود۔ در کار خوب روئے بہ رغبت تمام می رفتند، و از کنار او جدا نمی شدند مگر بہ حیلہ، و از بن شعور مصرع موزوں می نمودند۔ از یں جا ست کہ می فرمودند کہ شاعری ودیعت فطری از خمیر طینت فقیر است۔"

اس کے علاوہ مسعود صاحب نے بہت سے تذکرہ نگاروں کے حوالے دیے ہیں جنھوں نے مرزا مظہر کی حسن پسندی کا ذکر کیا ہے مثلاً رائے بھگوان داس ہندی لکھتے ہیں:

"عاشق پیشہ بود ہموارہ در سرش سودائے پری رخاں جا داشت۔" (سفینۂ ہندی قلمی) شیخ مصحفی نے "عقد ثریا" میں لکھا ہے۔ "در ابتدائے شعور عشق در طینتش مضمر بود۔"

مصطفیٰ خان شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں لکھا ہے

"ہنگامۂ عاشقی گرم داشت، شورش در سر و بہ رعنا جوانان نظرش بود۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ از سلام سندیلوی ص ۵۵۲–۵۵۹)

اکبر علی خان اڈیشنل ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور:

آپ نے تلاش و تحقیق کی انتہا فرما دی ہے اور محمد حسین آزاد پر الزامات کا مدلل رد فرمایا ہے۔ (مکتوب عرشی زادہ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء)

رزم نامۂ انیس

سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۵۵ء

یہ بارہ سو چون (۱۲۵۴) بند کی بلند پایہ نظم مراثی انیس کے بہترین اقتباسات کی فنکارانہ ترتیب کا نتیجہ ہے جس میں امام حسین کی ولادت سے شہادت تک کے واقعات کا تفصیلی بیان بہتر سے بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

دیباچہ کتاب کے چند اقتباس نقل کیے جاتے ہیں جو کتاب کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

"میر انیس کے مرثیوں میں رزمی عناصر دیکھ کر اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کر کے میری طرح بہتوں کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش اس شاعر اعظم نے کربلا کے عظیم واقعے پر ایک طویل رزمیہ نظم تصنیف کی ہوتی جو ہماری شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتی اور جسے ہم دنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کے مقابلے میں پیش کر سکتے۔ میری یہی تمنا آخر کار اس کی متقاضی ہوئی کہ انیس کے مرثیوں سے مناسب اقتباسات منتخب کر کے انھیں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ایک مسلسل رزم نامہ وجود میں آجائے۔ یہ کام جتنا آسان اور سہل الحصول معلوم ہوتا تھا اتنا ہی دشوار اور صبر آزما نکلا۔ مناسب اقتباسات کی جستجو میں مراثی انیس کے ضخیم مجلدات کا بار بار مطالعہ کرنا پڑا، اور ان متفرق اقتباسات سے ایک مسلسل نظم مرتب کرنے کی کوشش میں بڑی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنا پڑی۔"

"مختلف مضمونوں اور مختلف فضاؤں کے مرثیوں سے اقتباسات لے کر یہ رزم نامہ

اس شرط کے ساتھ تیار کرنا تھا کہ اس کے اجزا میں کہیں تضاد، تناقض یا عدم مطابقت کا احساس نہ ہو اور اس کی فضا میں کیفیات کی گوناگونی، جذبات کی بوقلمونی اور مناظر کی رنگارنگی کے باوجود ایک عام یک رنگی اور ہمواری قائم رہے۔"

"ہر ممکن ذریعے سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ متفرق اجزا کا ایسا مجموعہ پیش کیا جائے جس میں جوڑ پیوند دکھائی نہ دیں۔"

"انیس کے بیشتر مرثیے رزمی اور رثائی عناصر سے مرکب ہیں اور چونکہ ان کا مقصد سامعین کے جذبات غم کو برانگیختہ کرنا ہے، اس لیے ان میں اکثر بجا طور پر رثائی عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے..... لیکن اس رزم نامے کا مقصد مرثیوں کے مقصد سے کچھ مختلف ہے۔ اس لیے اس میں رزمی اور رثائی عناصر کے امتزاج میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھا گیا ہے۔"

"انیس نے واقعۂ کربلا کو کہیں ایک خانگی اور خاندانی سانحے کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہیں انسانی تاریخ کے ایک اہم اور عظیم واقعے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس رزم نامے میں مرثیوں کے اُن مقامات کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے جن سے واقعۂ کربلا کی عالمی اور انسانی حیثیت نمایاں ہوتی ہے..... یعنی واقعۂ کربلا کو فلکی اور ملکی سطح پر نہیں بلکہ ارضی اور بشری سطح پر رکھا گیا ہے۔"

دیباچۂ کتاب کے ان اقتباسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزم نامہ کیوں کر مرتب کیا گیا اور اس کی ترتیب میں کون اصول ملحوظ رکھے گئے۔ اب ایک اقتباس اور پیش کیا جاتا ہے جس سے ایک بظاہر بہت وزنی اعتراض کا، جو مرثیوں پر عام طور سے وارد کیا جاتا ہے، پہلی مرتبہ شافی اور مسکت جواب ملتا ہے:-

"بعض لوگوں کو مرثیوں میں اہل حرم کی گریہ و زاری کا بیان ان کی شان صبر کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قریب ترین عزیزوں کی موت پر رونا اور

بین کرنا نسوانی بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اور اسی ذریعے سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ امام حسین کے اہلِ حرم کو اپنے عزیزوں سے کس حد کی محبت تھی۔ اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی انتہائی محبت ادائے فرائض پر کبھی غالب نہیں آسکی اور انھوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں اور آنکھوں کے تاروں کو تلواروں کے جنگل، نیزوں کے نیستاں اور تیروں کی بارش میں بے تامّل بلکہ بہ اصرار بھیج دیا تو ان کے بین اور بکا سے ان کی بے صبری ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کا صبر اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اگر باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کی دائمی مفارقت پر ان کو غیر متاثر دکھایا جاتا تو صبر اور سنگدلی میں امتیاز کیونکر ہوتا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ:

"سید مسعود حسن رضوی اس وقت شاید میر انیس کے کلام کے بہترین شارح و ترجمان اور ان کی عظمت و ناموری کے عظیم ترین نقیب ہیں۔ ..... انھوں نے انیس کے سیکڑوں مرثیوں سے چھانٹ کر ایک مسلسل اور خاصی طویل رزمیہ نظم مرتب کر دی ہے۔ یہ کام اس نوک پلک کے ساتھ انجام دینا۔۔ آسان نہ تھا۔ اس کی ہمت وہی کر سکتا تھا جو ایک طرف نفسیاتِ بشری کی این و آں کا رمز شناس ہو، دوسری طرف شعر و ادب کی نزاکتوں پر نظر رکھتا ہو اور تیسری طرف کلامِ انیس اس کے رگ و ریشے میں بس چکا ہو۔ .... رزم نامہ اب ایک مرتب و مکمل شکل میں ہے اور اس سے جتنا کمال اصل شاعر کا نکلتا ہے اس سے کچھ ایسا ادب کم پایہ مرتّب کا بھی نہیں رہتا۔ کتاب بہت سے عنوانات کے تحت تقسیم ہے اور پھر ہر عنوان کے ذیل میں بہت سے ذیلی عنوان۔ گویا معرکۂ کربلا کا ہو بہو، موبہ مو نقشہ ایک صاحبِ فن کے قلمِ معجز رقم سے۔"

رزم نامۂ انیس کے جواب میں رزم نامۂ دبیر شائع ہو گیا۔ ایک بیباک ناقد نے

تقابلی نظر ڈال کر اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اپنے ایک خط میں یوں کیا ہے:

"رزم نامۂ انیس کے جواب میں رزم نامۂ دبیر شائع کر لیا گیا۔ مجھے اب دیکھنے کو ملا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لوگوں کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے کہ لکھنا آئے یا نہ آئے، تحقیق و تنقید کے مبادیات سے بھی واقف ہوں یا نہ ہوں، کتاب ضرور لکھیں گے۔"

تذکرۂ نادر

سرفراز پریس، لکھنؤ ۱۹۵۷ء

کتاب کے فٹ نوٹوں میں ماخذوں کی تعداد گیارہ ہے۔

اعتصام الدولہ میرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ نادر تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اردو کے پانچ سو اکیس شاعروں کی غزلوں کو مخمس کیا اور نعت و منقبت میں چند طبع زاد مخمس شامل کر کے ان کا مجموعہ دیوان غریب کے تاریخی نام سے مرتب کیا جس سے اس کی تالیف کا سال ۱۲۸۳ھ نکلتا ہے اور ۱۲۸۴ھ میں مطبع دلکشا فتح گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا۔ ہر شاعر کی غزل پر اس کے ضروری حالات مختصراً لکھ دیے۔

مسعود صاحب نے دیوان غریب کو نئی ترتیب سے مرتب کر کے تذکرۂ نادر کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمے کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے تذکرے کی اہمیت، اس کی ترتیب کی کیفیت، اور اشاعت کا مقصد واضح ہو جاتا ہے:-

"یہ کتاب (دیوان غریب) کمزور کاغذ پر چھاپی گئی تھی جو اب اپنی عمر پوری کر چکا ہے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ ذرا بے احتیاطی سے ورق الٹا اور اس کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں رہ گیا۔ کتاب کی یہ حالت دیکھ کر اپنے اتنے بہت سے شاعروں کو گمنامی سے بچانے کی خواہش بے اختیار میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کو ایک تذکرے کی

صورت میں مرتب کر کے تذکرۂ نادر اس کا نام رکھ دیا۔ شاعروں کے جو حالات نادؔر نے لکھے ہیں وہ بے کم وکاست لے لیے گئے ہیں۔ اور ان کے لگائے ہوئے مصرعے چھوڑ کر ہر شاعر کی ایک غزل کے مطلع و مقطع سمیت پانچ شعر لے لیے گئے ہیں۔ نادر نے خود بھی بیشتر غزلوں کے صرف پانچ پانچ شعروں پر مصرعے لگائے ہیں۔

"تذکرۂ نادر میں ایسے بہت سے شاعروں کا مختصر حال اور نمونہ کلام مل جائے گا جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ بعض نامور شعرا جو غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں ان کی غزلیں بھی اس تذکرے میں موجود ہیں۔ مثلاً ضمیرؔ، خلیقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، انسؔ، مونسؔ، یہ تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کے ایک دور کے لیے معتبر ماخذ کا کام دے سکتا ہے۔"

تذکرۂ نادؔر کے مقدمے میں مرتبِ تذکرہ نے نادؔر کی جن تصنیفوں کا ضروری توضیحات کے ساتھ ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں شوکتِ نادری، صولتِ نادری، خاتمۃ المناقب عرف چہل بند نادری، شرح خاتمۃ المناقب، فضائل الشہدا، تلخیص معلّی، سرب لاتحہ، دیوان غریب، نظم نادر، توصیف زراعت، خلاصۂ قانون مال و کلکٹری۔ محسنؔ نے سراپا سخن میں اور ناصرؔ نے خوش معرکۂ زیبا میں نادر کے چار دیوان بتائے ہیں۔

ڈاکٹر نورالحسن نوؔر تذکرہ نادر مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے مرتب موصوف کا فاضلانہ اور تحقیقی مقدمہ جو اس کتاب میں شامل ہے پڑھا۔ انھوں نے جناب نادر کی جملہ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ مگر ایک اہم تصنیف کا ذکر اس مقدمے میں نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف فاضل مقدمہ نگار کی نظر سے نہیں گزری۔ اور وہ ہے جناب نادر کا دیوان پنجم۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موسوم بہ شکرستان نادر میرے پاس موجود ہے۔"[1]

---

[1] ہفت روزہ ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ جنوری ۷۲ ۱۹ء صفحہ

فسانۂ عبرت مصنفۂ مرزا رجب علی بیگ سرور

مرتبہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب

تنظیم پریس، لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۷ء

دیباچہ کتاب میں سرور کی تصنیف تالیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ

"معلوماتی نقطۂ نظر سے سرور کی سب سے زیادہ قابل قدر کتاب 'فسانۂ عبرت' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اودھ کے آخری چار بادشاہوں یعنی نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ اور ان کے عہد کے وہ حالات بیان کیے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھے یا اپنے کانوں سے سُنے تھے۔۔۔۔ اس کتاب کا سب سے زیادہ نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس میں اس عہد کی شاہی تفریحوں، تقریبوں اور ثقافتی مظاہروں اور نمائشوں کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے۔۔۔۔ یہاں آپ کو میلوں اور بازاروں کی بھیڑ بھاڑ، شادی بیاہ کی دھوم دھام، براتوں کے شاہی جلوس، ناچ گانے کی محفلیں، رہس کے جلسے سبھی کچھ تو دکھائی دے گا۔"

دیباچے کا ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو:

یہ کتاب اب بہت کمیاب ہو گئی ہے اور اس کا کاغذ اس قدر بوسیدہ اور خستہ ہو گیا ہے کہ ورق کو ہاتھ لگایا اور وہ مجروح ہوا۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ کتاب ناپید ہو جائے گی اور اودھ کے تاریخی اور ثقافتی حالات کا ایک اہم ماخذ تلف ہو جائے گا۔ اس صورتِ حال نے راقم کو اس کتاب کی ترتیب و اشاعت پر آمادہ کر دیا۔

کتاب کے دیباچے پر نظر کرنے سے واضح ہوگا کہ اس کی ترتیب میں کتنی محنت

کی گئی ہے اور کس سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔

تبصرے :-

"فسانۂ عبرت اپنے وقت کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہوئے تاریخ اودھ کا ایک اہم جزو رہا ہے ۔۔۔۔ یہ تحریر ان تاریخی صداقتوں کی حامل ہے جن کی تلاش تاریخ اودھ کے مطبوعہ ذخیروں میں کرنا فعل عبث ہے۔

اودھ اور تاریخ کے ایک نادر نمونے کو جو امتداد زمانہ سے ملیامیٹ ہوتے جا رہا تھا، پروفیسر مسعود حسن صاحب نے از سر نو مرتب کیا ہے ۔۔۔۔ پروفیسر صاحب نے نئی چھاپ میں عنوانات قائم کر کے ملتے جلتے مطالب کی الگ الگ تقسیم کر دی ہے اور عبارت کو پاروں میں بانٹا ہے ۔۔۔ اب فسانۂ عبرت ادب اور تاریخ کا ایک نادر ماخذ بن کر سامنے آیا ہے"۔ (روزنامہ قومی آواز، لکھنؤ ۱۳ جنوری ۵۸ ۱۹ء)

"اودھ کے آخری چار بادشاہوں کے اس میں حالات ہیں ۔۔۔ لیکن اب تاریخ سے کہیں بڑھ کر ادب و انشا کی کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے"۔

(صدق جدید، لکھنؤ، یکم اگست ۵۸ ۱۹ء)

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

پہلا ایڈیشن: تنظیم پریس، لکھنؤ ۵۷ ۱۹ء

ماخذوں کی تعداد ۶۷

تصویریں: یک رنگی بلاک۔ مصنف کتاب۔ واجد علی شاہ۔ واجد علی شاہ کی تحریر کا عکس۔ شاہی رہس کا ایک منظر۔

سہ رنگی بلاک۔ واجد علی شاہ فوجی قواعد کے میدان میں۔ واجد علی شاہ پری خانے میں۔

دوسرا ایڈیشن۔ نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

ماخذوں کی تعداد ۲۷

تصویریں۔ وہی جو پہلی چھاپ میں شامل ہیں۔

اس کتاب کے مضامین مختصراً یہ ہیں۔ ڈرامے سے پہلے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر۔ اردو کا پہلا ڈراما واجد علی شاہ کے قلم سے۔ اردو ڈرامے کا پہلا اسٹیج شاہی محل میں۔ شاہی ڈرامے کے اداکار، پوشاکیں، زیور اور دوسرا ساز و سامان۔ تین اور شاہی ڈرامے۔ قیصر باغ کا جوگیا میلہ۔

احتشام صاحب کا سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ شاہی اسٹیج پر رہس کے علاوہ اور ڈرامے نہیں پیش کیے جاتے تھے۔

جواب۔ یہ بات رہس کے اصلی مفہوم کے لحاظ سے غلط ہے۔ مگر اس کے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ رہس اصل میں اُس کھیل کو کہتے ہیں جس میں کنھیا کی زندگی کے، خاص کر ان کے بچپن کے واقعات دکھائے جائیں۔ مگر پرانی طرح کی رہس دھاریوں کی ٹولیاں رہس کے علاوہ بعض دوسرے قصے بھی کھیلتی تھیں اور وہ بھی رہس ہی کہلاتے تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنی شہزادگی کے دنوں میں جو ناٹک تیار کیا تھا وہ رادھا کنھیا کی روایتی داستان محبت پر مبنی تھا یعنی وہ اصلی معنوں میں رہس تھا۔ بعد کو ان کی بادشاہی کے زمانے میں ان کی رومانی مثنویوں سے جو ڈرامے تیار کیے گئے گئے وہ بھی رہس کہلانے لگے۔ اس طرح لفظ رہس کے معنوں میں توسیع ہوگئی اور وہ ناٹک اور ڈرامے کا مترادف ہو گیا۔

یہ کتاب ادبی تحقیق کا بے مثال شاہکار ہے۔ متعدد ناقدوں نے اس کا مقام اور مرتبہ معین کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کے چند بیانوں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ: "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ہمارے عہد کا سب سے اہم بالشان کارنامہ ہے۔ تحقیقی کارنامے کی حیثیت سے عصر حاضر کی ادبی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ . . . مسعود صاحب اردو ڈرامے کی تاریخ کو کئی برس پہلے لے آئے ہیں اور واجد علی شاہ کا ڈراما رادھا کنھیا کا قصہ صحیح متن، اسٹیج اور اداکاری کی ہدایات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہی کارنامہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس ڈرامے کی تفصیلات، اسٹیج کی ترتیب، اداکاروں کی حیثیت، ان کی پوشاک، زیورات، رقص کی کیفیت حتیٰ کہ ان کی تنخواہوں کی تفصیل تک . . . بیان کر دی ہے . . . اور یہ سارا کام تحقیقی شواہد کے ساتھ کیا گیا ہے . . . . . تحقیق و تنقید کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کس طرح مختلف غیر متوقع ماخذوں سے معلومات ریزہ ریزہ کر کے جمع کی گئی ہیں اور ان کو مناسب موقعوں پر استعمال کر کے ایک مسلسل اور مربوط بیان کی شکل دی گئی ہے، کس طرح تاریخوں کے تعین میں مختلف بیانات کی صحت اور عدم صحت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور کس طرح ایک ایک اصطلاح کے رموز اور اسرار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تحقیق اور کاوش کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔ کتاب میں تصویریں بھی شامل ہیں . . . . ان تصاویر کی فراہمی بغیر انتہائی جستجو اور کاوش کے ناممکن تھی"۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۸ء

رسالہ 'افکار'، کراچی:

"ایک زمانے تک لکھنوی تہذیب بے شمار غلط فہمیوں کا شکار رہی۔ . . . . اس زمانے میں اسٹیج اور ڈراما کے سلسلے میں جو عظیم کام ہوا اس کی طرف بھی لوگ متوجہ نہیں ہوئے . . . اس کا صحیح اور مکمل جائزہ ان لوگوں نے ابھی نہیں لیا جو زندگی بھر ڈرامے کے موضوع پر کام کرتے رہے . . . . . اس اہم اور ضروری کام کو پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے انجام دیا ہے . . . . . پروفیسر صاحب اس زمانے میں لکھنوی تہذیب

اور معاشرت کے صحیح مزاج داں ہیں ...... اس تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر جتنا مواد انھوں نے جمع کیا ہے کوئی دوسرا اس کو جمع کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کے بعض ایسے پہلوؤں کی اہمیت واضح کی ہے جن کی طرف لوگ تنگ نظری، تعصب یا غلط فہمی کے باعث متوجہ نہیں ہو سکے .... یہ کتاب اُس زمانے کے رنگین جلسوں اور پرکار محفلوں کا ایک نہایت دلآویز مرقع بن گئی ہے۔ ... داستان تو اس میں شاہی اسٹیج کی بیان کی گئی ہے لیکن در حقیقت یہ ساری داستان اس زمانے کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی کہانی ہے ..... ان کی پیش کی ہوئی تفصیلات کو پڑھنے میں داستان اور ناول کا سا لطف آتا ہے۔

یہ صحیح معنوں میں ایک تحقیقی کتاب ہے اور مسعود صاحب نے بڑی ہی عرق ریزی سے اس کو ترتیب دیا ہے ..... اتنی نایاب اور کمیاب کتابوں کو فراہم کر کے دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ...... اس کتاب نے ادبی تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہو۔ یہ معیار ان محققوں کے لیے شمع راہ ثابت ہو سکتا ہے جو صرف حوالے دینے اور حاشیے لکھنے کو ادبی تحقیق سمجھتے ہیں ...... اردو میں ادھر عرصے سے ایسی دلچسپ تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی۔"

از: عبادت بریلوی

ریڈیو پاکستان، لاہور:-

"اس کتاب میں اسٹیج کی تاریخ، اس کی تہذیبی و معاشرتی اہمیت اور اس کے مختلف فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب سے پہلے پس منظر کے طور پر مسعود صاحب نے ڈرامے کی ابتدا، ناٹک کی قدامت، قدیم ہندوستانی اداکاری، رام لیلا اور رہس وغیرہ پر بحث کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انھیں بنیادوں پر لکھنوی اسٹیج کی عمارت تعمیر کی گئی۔ ..... اس میں صرف لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کی داستان ہی نہیں ہے اس زمانے کے تاریخی حالات، معاشرتی ماحول، تہذیبی فضا اور ادبی و فنی زندگی کی تصویر کشی

بھی کی گئی ہے۔" ۲۷ اپریل ۱۹۵۹ء

ریڈیو پاکستان، راولپنڈی: "اردو ڈرامے کے آغاز اور اس کی ابتدائی ترقی پر یہ غالباً پہلی کتاب ہے جو نہایت جانفشانی سے لکھی گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مستند و معتبر تاریخی حوالوں سے مدد لے کر موضوع زیر بحث پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔"

۱۳ ستمبر ۱۹۶۰ء

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج

طبع اول۔ سلیمی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۵۷ء

ماخذوں کی تعداد ۵۳

تصویریں۔ اندر سبھا طبع اول کا سرورق۔ طبع سوم کا سرورق۔ امانت کی تحریر۔ امانت کا قطعۂ توثیق۔

طبع دوم۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

ماخذوں کی تعداد ۸۴

تصویریں وہی جو طبع اول میں شامل تھیں۔

اس کتاب میں عوامی اردو اسٹیج کے بانی امانت لکھنوی کے حالات و تصنیفات، امانت کی مرثیہ گوئی، عوامی اسٹیج کے لیے پہلا ڈراما اندر سبھا اور اس کا کھیل، اندر سبھا کی مقبولیت اور اس کے تتبع میں لکھے ہوئے ناٹک اور سبھائیں، اندر سبھا کا مکمل متن، یہ اور ان کے سوا بیسیوں موضوعات پر مستند تفصیلات کا حیرت خیز ذخیرہ موجود ہے۔

امانت کی اندر سبھا کے تین نسخے اندر سبھا مع شرح کے نام سے تین مختلف مطبعوں میں ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئے۔ اس سال کے بعد اندر سبھا بلا مبالغہ سیکڑوں مرتبہ چھاپی گئی مگر

شرح کسی میں شامل نہیں کی گئی اور اردو کے ادیب، تذکرہ نویس اور مورخ اس کے وجود سے بے خبر رہے۔ مسعود صاحب نے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو' کے اپریل ۱۹۲۷ء کے شمارے میں ایک مقالہ 'اندر سبھا اور شرح اندر سبھا' کے عنوان سے شائع کر کے اردو دنیا کو اس شرح سے باخبر کیا۔ مولانا احسن مارہروی اس مقالے کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"عام طور سے اندر سبھا امانت نظم میں مشہور ہے۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی نے اپنے ایک محققانہ مضمون کے ساتھ اس کی شرحِ نثر کو جو خود امانت کی لکھی ہوئی ہے، اپریل ۱۹۲۷ء کے رسالہ 'اردو' اورنگ آباد دکن میں چھپوا کر اردو کے لیے بہترین تاریخی سرمایہ بہم پہنچایا ہے۔"

(تاریخ نثر اردو، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۳۸)

یہ مقالہ ان غلط قیاسوں کی رد میں لکھا گیا تھا جو محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے اپنے مضمون 'ہندوستان کا ڈراما' میں اندر سبھا کے بارے میں قائم کر کے رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع کیے تھے اور مولانا شرر کے انتباہ کے باوجود اپنی کتاب 'ناٹک ساگر' میں ان کا اعادہ کیا تھا۔

'شرح اندر سبھا' مصنف اندر سبھا کی اپنی کتاب پر مبسوط مقدمہ ہے جو اس مقصد سے لکھا گیا تھا کہ "اس طرح نثر میں جلسے کا بیان ہو کہ سب کو تصور میں تصویر اندر سبھا کا گمان ہو"۔ امانت کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی۔ شرح کو پڑھ کر اندر سبھا کے کھیل کا نقشہ جزئیات و تفصیلات کے ساتھ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس شرح سے متاثر ہو کر ادیب نے امانت اور اندر سبھا پر تحقیق شروع کر دی جو ان کے طریق کار کے موافق سالہا سال جاری رہی۔

اس درمیان میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی فرمائش پر ادیب نے اودھ شاہی

اسٹیج کے مختلف پہلوؤں پر پانچ تقریریں تیار کیں جو ۱۹۴۳ء کے مختلف مہینوں میں نشر کی گئیں۔ تحقیق کا کام جاری رہا اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۶ء تک تیس برس کی تلاش و تحقیق کے نتیجے میں ادیب کی معرکہ آرا کتاب اردو ڈراما اور اسٹیج شائع ہوئی۔ جس کے دو حصے لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج مستقل کتابوں کی صورت میں بھی شائع کیے گئے۔ ادیب کی مسلسل تلاش کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ پیش نظر کتاب کی پہلی اشاعت میں ماخذوں کی تعداد جو ترپن تھی وہ دوسری اشاعت میں اسّی سے متجاوز ہو گئی۔

اس کتاب کا ہر عنوان انتہائی تحقیق کا ثمرہ ہے لیکن اس کے چند عنوان مصنف کی وسعت معلومات، عرق ریزی اور نکتہ رسی کے مثالی کارنامے ہیں۔ وہ عنوانات یہ ہیں، اندر سبھا کا قصہ اور اس کے ماخذ، اندر سبھا کے کھیل پر ایک تقابلی نظر اندر سبھا کی زبان، اندر سبھا کے گیتوں کی زبان۔

ہم اب تک اندر سبھا کو امانت کا طبع زاد ناٹک سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن زیر مطالعہ کتاب میں اندر سبھا کا قصہ بیان کر کے اس کے ماخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس طرح یہ حقیقت پہلی مرتبہ سامنے آتی ہے کہ امانت نے اس ناٹک کے اجزا کہاں کہاں... لے کر یہ خوبصورت مرقع تیار کیا ہے، ناٹک کے قصے کا طبع زاد نہ ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ شیکسپیر کے سے عظیم ڈرامہ نگار نے اپنے ڈراموں کے قصے مختلف ماخذوں سے لیے ہیں۔

اندر سبھا کو بیشتر نقاد ادنیٰ درجے کا ناٹک سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن اس میں ہمعصر مغربی نقادوں کے نظریوں سے جو مطابقت نظر آتی ہے اور اس کے کھیل میں قدیم ہندوستانی ناٹک، فرانسیسی اوپیرا، اطالوی اور برطانوی ڈراموں کے کھیلوں سے جو مماثلت ملتی ہے اس کو تفصیل سے بیان کر کے ادیب نے اندر سبھا کی ادبی اور

نتی منزلت اور امانت کی طبیعت میں ڈرامانگاری کی فطری صلاحیت نمایاں کردی ہو۔
پیشِ نظر کتاب کا عنوان " اندر سبھا کے کھیل پر ایک تقابلی نظر " بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔

ادیب نے اپنی کتاب میں اندر سبھا کا مکمل متن ایسے پانچ نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے جو امانت کی زندگی میں شائع ہوئے تھے اور اب کمیاب بلکہ نایاب ہو گئے ہیں۔ ان میں وہ نسخہ بھی ہے جس کی صحت کی توثیق امانت نے ایک قطعے میں کر کے اس پر اپنی مہر لگا دی ہے۔ قطعہ حسبِ ذیل ہے۔

گذر کر دہر میں اپنی نظر سے　　　صحیح اندر سبھا بس یہ چھپی ہے
غلط اس میں نہیں ہو ایک نقطہ　　　برائے صحت اس پر مہر کی ہے

احتشام صاحب نے مسعود صاحب سے ملاقات کر کے ان کی لاجواب تحقیقی تصنیف اردو ڈراما اور اسٹیج کے بارے میں بہت سی ضروری باتیں دریافت کیں۔ یہ ملاقات آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے ۲۸ جون ۱۹۶۰ء کو نشر کی اور اپنے پندرہ روزہ رسالے آواز میں ۲۲ جولائی ۱۹۶۰ء کو شائع کی۔ احتشام صاحب کے دو سوال جو زیر تبصرہ کتاب سے متعلق تھے اور مسعود صاحب کے تفصیلی جواب یہاں درج کیے جاتے

سوال۔ آپ نے اپنی تحقیقات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے لکھنؤ کا شاہی اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ آپ کے خیال میں اردو ڈرامے کے ارتقا میں ان میں سے کسے اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی فرمایئے کہ جدید اسٹیج سے ان کا کیا تعلق ہو۔ میرا مطلب ... اسٹیج سے ہے جو مغربی اثرات سے وجود میں آیا۔

جواب۔ شاہی اسٹیج کی اہمیت تو ظاہر ہے کہ اردو ڈرامے کی بنیاد اسی سے پڑی اور اسی کے اثر سے اردو کا عوامی اسٹیج وجود میں آیا۔ شاہی اسٹیج پر کئی ڈرامے اتنے قیمتی اور شاندار ساز و سامان کے ساتھ کھیلے گئے جیسا عوامی اسٹیج کو کبھی میسّر

نہیں ہوا۔ لیکن عوامی اسٹیج کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسی نے عوام میں ڈراما دیکھنے کا اتنا شوق پیدا کیا کہ بہت سی ناٹک منڈلیاں بن گئیں، جو اجرت پر ڈرامے کھیلنے لگیں اور میلوں، تہواروں اور خوشی کی تقریبوں میں ناٹک دیکھنے دکھانے کا رواج عام ہو گیا۔ عوام کے اس بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر بمبئی کے کچھ پارسیوں نے مغربی طرز کے جدید اسٹیج کی بنیاد ڈالی۔ متعدد کمپنیاں بڑے بڑے سرمائے سے قائم کیں اور ڈرامے کی دل چسپی میں اتنا اضافہ کیا کہ تفریح کے سارے سامان اس کے آگے ماند پڑ گئے۔ ان کمپنیوں نے اندر سبھا کو بھی اپنے اپنے طور پر ترتیب دے کر پیش کیا۔

سوال۔ ایک بات اور! اندر سبھا امانت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اپنی کتاب میں کتنی اور سبھاؤں کا ذکر کیا ہے۔ آپ کے خیال میں ڈرامے کی تاریخ میں ان کوششوں کی بھی کچھ اہمیت ہے یا نہیں؟

جواب۔ اندر سبھا کے طرز پر جو دوسری سبھائیں لکھی گئی ہیں، ان میں کوئی بھی کسی حیثیت سے اندر سبھا کی برابری نہیں کر سکتی۔ لیکن ڈرامے کی تاریخ میں ان کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے عوام کے مختلف طبقوں کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا۔ امانت کی اندر سبھا عوام کے پڑھے لکھے متوسط طبقے کے مذاق کے موافق تھی۔ اس سے نیچے طبقے کو مداری لال کی اندر سبھا زیادہ پسند آتی تھی۔ اس کے مکالموں میں طوالت اور تکرار کا عیب نمایاں طور پر موجود ہے۔ مگر اس کو پسند کرنے والا طبقہ اسی بنا پر اس کو امانت کی اندر سبھا پر ترجیح دیتا تھا۔ ناگر سبھا جو عرف عام میں 'بیبر' کہلاتی تھی ہر طرح کی ادبی اور عروضی غلطیوں سے بھری اور ہر حیثیت سے بہت ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔ مگر وہ اپنے سارے عیبوں کے باوجود، بلکہ انھیں کی وجہ سے عوام کے ادنیٰ اور ان پڑھ طبقے میں، سب سے زیادہ مقبول تھی۔ جو طبقہ اندر سبھا کا دلدادہ تھا وہ بھی آخر یہی ایک کھیل کہاں

تک دیکھتا رہتا۔ جشن پرستان اور بزم سلیمان کے سے ناٹک ان کے سخو کا ر ۵۰ اور ڈرامے سے ان کی دلچسپی قائم رکھنے کا کام دیتے تھے۔ ان طرح ان سبھی سبھاؤں اور ناٹکوں کو اردو ڈرامے کی تاریخ میں کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور حاصل ہے۔

جب پارسی تھیٹریکل کمپنیاں اندر سبھا کا کھیل بہتر ساز و سامان کے ساتھ تربیت یافتہ اداکاروں کے ذریعے سے دکھانے لگیں تو پرانی طرح کی ناٹک منڈلیوں نے اندر سبھا امانت کا کھیل موقوف کر دیا۔ لیکن "اندر سبھا مداری لال" کا کھیل بہت دن بعد تک جاہل عوام میں جاری رہا۔ ادیب نے ان کھیلوں کے عینی شاہد غیر معمولی تلاش کے بعد ڈھونڈھ نکالے۔ امانت کی اندر سبھا کو دیکھنے والے پچانوے سال کے صرف ایک بزرگ نواب منصور علی خاں عرف منجھو صاحب رمال مل سکے۔ مداری لال کی اندر سبھا میں کام کرنے والے تین افراد کا پتا لگا، یعنی مداری لال کے خلیفہ منے نواب اور دو اداکار نظیرن اور بادو اللہ خاں۔ ادیب نے ان کم حیثیت لوگوں کے گھروں پر جا جا کر ان کے بیان لیے۔ تحقیق کی یہ دھن ادیب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مصنف کی کتاب "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" کو مبصروں نے تحقیق و تلاش کا شاہکار اور محیر العقول کارنامہ قرار دیا ہے۔ "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" پر بھی ان کی یہ رائے پوری طرح صادق آتی ہے۔

تبصرے

اختر انصاری اکبر آبادی: اردو کے عوامی اسٹیج کے بانی امانت لکھنوی تھے.... امانت کی تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کے شاگردوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ ڈراما اور دوسری کے قدیم نسخے حاصل کر کے مصنف نے ایک خاص انداز سے ترتیب دیا ہے...... اندر سبھا میں کچھ گیت بھی شامل ہیں، جن کی زبان کافی حد تک نامانوس ہے۔ مسعود صاحب نے ان گیتوں میں [معیاری اردو سے] جو صوتی، صرفی، نحوی اور لفظی اختلافات ہیں ان پر بھی بڑے عالمانہ انداز میں اظہار رائے کیا ہے۔ (ماہنامہ نئی قدریں، حیدرآباد سندھ ۱۹۵۹ء)

ریڈیو پاکستان، راولپنڈی": اندر سبھا کی تاریخی حیثیت مسلّم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی اور فنی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی۔ اس لیے اس کے ایک مستند ایڈیشن کی ضرورت تھی۔۔۔ چنانچہ انھوں [مسعود حسن رضوی] نے سالہا سال تلاش اور کاوش کی۔ اندر سبھا کے متعدد نسخوں کا مقابلہ کیا۔۔۔۔ ان تمام نسخوں کی مدد سے انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ موجودہ نسخے کی ترتیب کی ہے۔۔۔۔ امانت لکھنوی کے حالات خاصی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اور ان کی دوسری تصنیفات اور شعر گوئی پر معلومات افزا تبصرہ کیا ہے۔۔۔۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔۔۔ ایک گراں قدر تحقیقی کارنامہ ہے"

ماہنامہ آجکل دہلی: "حق یہ ہے کہ اندر سبھا سے متعلق ایسی جامع کتاب لکھنؤ ہی کا حصہ تھا۔ اور ادیب صاحب سے موزوں تر آدمی اور کون ہو سکتا تھا۔"

اردو ڈراما اور اسٹیج

پہلا ایڈیشن۔ تنظیم پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء

ماخذوں کی تعداد ۶۷ + ۵۳ = ۱۲۰

تصویریں۔ یک رنگی بلاک۔ مصنف کتاب۔ واجد علی شاہ۔ واجد علی شاہ کی تحریر کا عکس۔ شاہی رہس کا ایک منظر۔ اندر سبھا طبع اول کا سرورق۔ اندر سبھا طبع سوم کا سرورق۔ امانت کا عکس تحریر۔ امانت کا قطعۂ توثیق

سہ رنگی بلاک۔ واجد علی شاہ فوجی قواعد کے میدان میں۔ واجد علی شاہ پری خانہ میں۔

دوسرا ایڈیشن۔ نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۵ء

ماخذوں کی تعداد ۷۲ + ۷۷ = ۱۴۹

تصویریں ۔ وہی جو پہلی چھاپ میں شامل ہیں ۔

اردو ڈرامے کا آغاز، اس کے عناصر ترکیبی، اس کی ارتقائی منزلیں، اس کا اسٹیج اور اسٹیج کا ساز و سامان، اس کے اداکار اور ان کی پوشاک وغیرہ یہ تمام چیزیں انتہائی تحقیق سے تمام امکانی تفصیلات کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ۔ اردو کا پہلا ڈراما واجد علی شاہ کے قلم سے مع ہدایات اداکاری وغیرہ کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے ۔ یہ کتاب تیس برس کے غور و فکر اور تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے ۔

مصنف کے دیباچے سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ واجد علی شاہ فنون لطیفہ کے سرپرست، اردو ڈرامے کے موجد، اردو اسٹیج کے بانی اور اسٹیج کی ہندوستانی روایتوں کے پابند تھے اور جن سے کتاب کا سبب تالیف اور مواد کی جستجو وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے ۔

"واجد علی شاہ اپنے زمانے میں موسیقی اور رقص کے سب سے بڑے سرپرست تھے ... لیکن ناٹک کے فن پر ان کا احسان موسیقی سے بھی زیادہ ہے ۔ یہ فن ہمارے ملک میں بالکل ذلیل ہو چکا تھا اور صرف ادنیٰ طبقوں میں بہت بگڑی ہوئی صورت میں باقی رہ گیا تھا ۔ واجد علی شاہ نے اس کو ذلت کے گڑھے سے اٹھا کر عزت کے سنگھاسن پر بٹھایا اور گلی کوچوں سے نکال کر شاہی محل میں پہنچایا ۔" صہ ۲۰

"واجد علی شاہ سر سے پاؤں تک پکے ہندوستانی تھے ۔ انگریزوں سے مطلق انس نہ تھا اور ان کے دربار میں انگریزوں کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا ..... انھوں نے لکھنؤ میں اسٹیج کی بنیاد ڈالی وہ خالص ہندوستانی تھا ۔ اس میں ہندوستان کے قدیم اسٹیج کی پیروی قدم قدم پر نظر آتی ہے ۔" صہ ۲۰-۲۱

"واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا ۔ اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لیے اٹھ رہا تھا ۔" صہ ۲۱

"واجد علی شاہی ڈرامے اور اسٹیج پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے۔ لیکن اگلے اہل قلم نے ناکافی معلومات کی بنا پر جو کچھ لکھا اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں . . . . ضرورت تھی کہ اردو ڈرامے کی مستند تاریخ لکھی جائے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے راقم حروف نے ماخذوں کی تلاش و دستیابی اور مواد کی فراہمی و ترتیب میں برسوں کا وقت صرف کر کے اردو ڈرامے اور اسٹیج کے کے پہلے دور کی مستند تاریخ تیار کر دی ہے، جو دو حصوں میں پیش کی جا رہی ہے، ایک لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور دوسرا لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ اگر اسی طرح چند اہل قلم ایک ایک دور کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دے لیں تو اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ تیار ہو جائے اور غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا دروازہ بند ہو جائے۔" ص ۲۲

چند خطوں کے مختصر اقتباس

ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریۂ ہند): "آپ نے سچ یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کیا ہے . . . . اس مستند تحقیقاتی کام پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔"

ڈاکٹر تارا چند: "آپ نے اردو زبان اور ادب میں تحقیق کا بالکل ایک نیا میدان نکال دیا ہے۔ آپ کی کتاب انتھک تحقیق اور وسیع معلومات کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔" (ترجمہ)

گوپی ناتھ امن: "سبحان اللہ! کیا تحقیق ہے، کتنی گرہیں سلجھائی ہیں! تحقیقی کتابوں میں اتنا دلچسپ بیان بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کئی معاملوں میں میری آنکھیں کھل گئیں . . . . آپ کی بدولت امانت کے مرثیے کے بھی چند بند پڑھ لیے۔"

پرنٹ سندر لال: "تصنیف بلاشبہ نہایت قیمتی اور مفید ہے . . . مواد جمع کرنے میں آپ نے جو محنت کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے . . . آپ کی تصنیف واجد علی شاہ کے قابل قدر کارناموں کو سامنے لانے میں بہت مدد دے گی۔ اردو زبان،

اردو ہندی کے تعلق اور ہندوستانی آرٹ فنون پر اس کتاب سے بڑی زبردست روشنی پڑتی ہے۔ نہایت کامیاب کوشش ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن: "یہ یقیناً ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس پر اردو ادب فخر کرے گا۔ آپ نے ڈرامے کی تاریخ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے اور پہلی بار اتنی مرتب اور مسلسل تاریخ لکھی گئی ہے۔ یہ عصر حاضر کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔"

علی جواد زیدی: "لکھنؤ میں اسٹیج کے ارتقا پر جو تحقیقی مواد آپ نے یکجا کر دیا ہے وہ ایک مستقل کارنامہ ہے۔ تاریخ کے کتنے ہی تاریک گوشے جگمگا اٹھے ہیں، کتنی ہی نئی راہیں نظر آگئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دونوں کتابیں بلا مبالغہ سال کی اہم ترین تصنیفات ہیں۔"

تبصرے

اختر انصاری اکبر آبادی: "اردو ڈراما اور اسٹیج مسعود حسن رضوی کی محققانہ تصنیف ہے۔ لکھنؤ کے شاہی اسٹیج اور اسٹیج کے موجد واجد علی شاہ کی زندگی اور مصروفیات پر سیر حاصل تبصرہ اتنے اچھے اور جامع انداز میں ہوا ہے کہ اس دور کے اودھ کی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ واجد علی شاہ اختر کی نایاب و نادر تصانیف کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اردو ڈرامے اور اسٹیج پر کوئی تفصیلی اور جامع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے سالہا سال کی محنت کے بعد اردو زبان کو اس موضوع پر ایک مثالی تحفہ عطا کیا ہے۔"

ماہنامہ نئی قدریں، حیدرآباد (سندھ)، ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر عبد العلیم نامی: "ہمارے ڈرامے کا سب سے تشنہ اور نامکمل باب اس کی تاریخ ہے، جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس ضمن میں ادیب لکھنوی (مسعود حسن رضوی) کی کتابیں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج اور اندر سبھا اور اندر سبھائیں، اردو ڈراما۔ ۔ کا ذکر بھی ضروری ہے۔" (ماہنامہ آجکل، دہلی، اردو نمبر اگست ۱۹۶۸ء)

ڈاکٹر گیان چند: "بالکل ابتدائی ڈرامے پر اردو کے بزرگ محقق سید مسعود حسن رضوی

کی کتاب اردو ڈراما اور اسٹیج تحقیق کا شاہکار ہے۔ اردو میں اس معیار کی تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔"
ماہنامہ آجکل، دہلی، اردو نمبر اگست ۱۹۶۸ء

سید علی جواد زیدی: "اردو ڈراما اور اسٹیج ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے وسعتِ مطالعہ اور دقّتِ نظر کا ثبوت دیا ہے اور بہت سا مواد پیش کیا ہے۔ اس کتاب پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے انعام بھی ملا ہے۔"

ماہنامہ آجکل، دہلی، اگست ۱۹۶۷ء

مظفر علی سید: "حال ہی میں ان کی دو کتابیں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج شائع ہوئیں جن سے اردو ڈرامے کے آغاز پر پہلی بار صحیح روشنی پڑی ہے۔"

نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۰ء

ڈاکٹر گیان چند: "سید مسعود حسن رضوی نے اردو کا شاہی اسٹیج میں واجد علی شاہ پر اور اردو کا عوامی اسٹیج میں امانت پر عالمانہ تحقیق کی۔"

ماہنامہ آجکل، دہلی، اگست ۱۹۶۸ء

اس پر ساہتیہ اکاڈمی نے مصنف کو پانچ ہزار روپے کا قومی انعام اور نشانِ امتیاز عطا کیا، اور اپنے شش ماہی رسالے انڈین لٹریچر میں کتاب کے بارے میں مصنف کا بیان[1] اور پروفیسر احتشام حسین کا مفصل تبصرہ[2] شائع کیا۔ نئی دہلی کے ہفتہ وار اخبار لنک[3] نے بھی کتاب اور مصنف کے بارے میں اپنے تاثرات شائع کیے۔ یہ تینوں مضامین انگریزی زبان میں ہیں اور اسی زیرِ قلم کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیے جائیں گے۔

---

[1] انڈین لٹریچر جلد ۳ نمبر ۱۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء تا مارچ ۱۹۶۰ء ص ۱۳۸-۱۴۰

[2] انڈین لٹریچر جلد ۳ نمبر ۲۔ اپریل تا ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۲۱-۱۲۵

[3] لنک (LINK) - ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء ص ۴۳

آئینۂ سخن فہمی

نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء

مصنف نے 'عرض حال' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے کتاب کا سببِ تالیف معلوم ہو جاتا ہے۔

میری کتاب ہماری شاعری پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری اشاعت کے پانچ برس بعد ۱۹۳۴ء میں ایک رسالہ جوہرِ آئینہ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے سرورق کی عبارت سے معلوم ہوا کہ وہ ایک ضخیم و حجیم کتاب کی پہلی جلد کی پہلی قسط ہے۔ اس کتاب کا نام ہے آئینہ اور اس کا موضوع ہے 'ہماری شاعری کی مفصل تنقید'..... اس رسالے کے مطالعے سے یہ راز کھلا کہ تنقید نام ہے خود بینی اور خود نمائی کا، عیب جوئی اور عیب تراشی کا، سخن پروری اور سخن سازی کا، سخت کلامی اور دل آزاری کا۔ راقم حروف نے اس پُر شور رجز خوانی خامہ فرسائی کا جواب خاموشی سے دیا..... جوہرِ آئینہ کی اشاعت سے تقریباً ایک سال بعد آئینہ جلد اول کی دوسری قسط منظرِ آئینہ کے نام سے نکلی..... اس رسالے میں سخت کلامی کے پتھر اور زیادہ وزنی اور طعن و تشنیع کے نشتر اور زیادہ تیز کر دیے گئے۔ اب وہ منزل آ گئی جہاں اپنے دفاع میں قلم اٹھانا فرض ہو گیا..... میرے چھ مضمون ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس سلسلے کے بقیہ مضامین کی اشاعت جو عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی تھی اب تک ملتوی ہی رہی۔ انھیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ نظرِ ثانی کے بعد اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے..... کوشش کی گئی ہے کہ حضرت نقاد کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود بحث میں تلخی نہ آنے پائے، ذاتیات سے قطع نظر کر کے صرف ان مسئلوں سے بحث کی گئی ہے جو جوہرِ آئینہ اور منظرِ آئینہ میں اٹھائے گئے ہیں اور وہ غلط فہمیاں دور کی گئی ہیں

جو ان رسالوں نے پیدا کی ہیں۔"

ہماری شاعری کا پہلا ایڈیشن نکلتے ہی مستند اہلِ علم و ادب نے اس پر تحسین و آفرین کی بارش کر دی۔ لیکن ایک فاضل نقاد نے اس کی مخالفت میں ایک کتاب آئینہ کے نام سے لکھنا شروع کر دی اور اس کی دو قسطیں جوہرِ آئینہ اور منظرِ آئینہ کے نام سے لکھ کر لفظوں کا ایسا جال بچھایا کہ بعض معتبر سخن شناس بھی اس میں پھنس کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے۔ ہماری شاعری کے نکتہ رس مصنف نے آئینۂ سخن فہمی میں حضرت نقاد کے اقوال کا منطقی اور نفسیاتی تجزیہ کر کے اس متانت و نفاست کے ساتھ اس جال کا تانا بانا بکھیر دیا ہے کہ ان کی یہ تصنیف علمی تنقید کا شاہکار بن گئی ہے اور مصنف آئینہ پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

عیب خود در پسِ آئینہ نہاں داشتہ
تو کہ آئینہ بہ عیبِ دگراں داشتہ

انیس احمد عباسی کا بیان ہے "مولانا محمد احمد بیخود مرحوم جو سید صاحب کے ہم وطن بھی تھے اور ایک زمانے میں ان کی ادبیت کے بہت قائل و معترف تھے، ایک مرتبہ راقم السطور سے کہنے لگے کہ جب مسعود صاحب میرے کسی شعر کی داد دیتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت وصول ہوئی۔ خود مسعود حسن صاحب بھی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں بیخود موہانی مرحوم کے کلام کے بڑے قدر داں تھے۔"

روزنامہ حقیقت ۲۳/۲۴ مئی ۱۹۵۲ء

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کو مسعود صاحب کے خلاف اس قلمی جہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

تبصرے

دو تبصروں کے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ایک تبصرہ روزنامۂ

قومی آواز لکھنؤ کے فاضل تبصرہ نگار مولوی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کے قلم سے ہے اور دوسرا پروفیسر ضیاء احمد بدایونی سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ یونیورسٹی کے قلم سے۔

"پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ... کی مقبول کتاب ہماری شاعری آج سے بتیس[۳۲] سال قبل پہلی بار جب شائع ہوئی تھی ...... تو لکھنؤ کے ادبی حلقے .... دو بڑے حصوں میں بٹے ہوئے تھے ..... ہماری شاعری بھی جو گہری فکر اور وسیع مطالعے کے نتیجے میں تصنیف پائی تھی اس دل بندی کے ہاتھوں [illegible] کی زد میں آئی اور مرحوم بیخود موہانی صاحب نے ہماری شاعری پر اس کی پہلی اشاعت کے چھ سات برس بعد تعقبات کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا .... اس کی صرف دو قسطیں جوہر آئینہ اور منظر آئینہ کے نام سے کتابچوں کی شکل میں سامنے آ سکیں۔

مرحوم بیخود صاحب کے زور قلم نے مسعود صاحب کی تصنیف پر ایسے ایسے پینتروں سے وار کیے تھے کہ عام قاری کا ذہن ہماری شاعری کو ضبط تحریر میں لانے والے قلم کی پُرکاری اور مشاقی میں شک کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ... سال ڈیڑھ سال تک اس قسم کے حملوں کو برداشت کرنے کے بعد پروفیسر مسعود حسن صاحب نے دفاع کی طرف توجہ کی اور ان کے نصف درجن جوابی مضامین کے ذریعے جو سال بھر کے اندر مختلف رسائل میں شائع ہوئے، اصل حقیقت آئینہ ہو گئی، او معترض یا نقاد کے انداز خاص کا بہتوں کو علم ہو گیا یعنی بات کو پھیلا کر رائی کو پہاڑ بنانا، نفس مسئلہ کو غیر متعلق بحثوں میں الجھانا، قاری کی توجہ کو اصل بحث سے ہٹا کر دوسری وادیوں میں بھٹکانا اور فلسفہ و منطق کے سہارے صاف اور سادہ بات کے ایسے ایسے پہلو نکالنا ... جن کے نتیجے میں ذہن مغالطوں کا شکار ہو جائے۔ بعض ایسے وزنی ایرادات

معترض کی طرف سے وارد کیے گئے تھے کہ بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان کا دفع کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن ایرادات کا جس خوبی کے ساتھ تجزیہ کر کے ہماری شاعری کے مصنف نے ان کے مسکت جواب حسن متانت کے ساتھ دیے وہ اردو ادب میں ایک اضافہ ثابت ہوا] اب یہ جوابی مضامین جن میں نصف درجن مطبوعہ اور باقی نو غیر مطبوعہ ہیں، آئینۂ سخن فہمی کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

اگرچہ اعتراض اور جواب، وقتی چیز ہوا کرتے ہیں اور جلد ہی اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں، لیکن ہماری شاعری سے متعلق یہ سارا مباحثہ علم بلاغت معانی و بیان کے ایسے ایسے نکتوں کا حامل ہے کہ پڑھنے والے اصل بحث سے خالی الذہن ہونے کے باوجود بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور خاص کر اس زمانے میں جب کہ بلاغت اور معانی و بیان کے فنوں سے نہیں، بلکہ ان کے ناموں تک سے ناواقفیت بڑھتی جارہی ہے' آئینۂ سخن فہمی کی ضرورت اور اہمیت کا اقرار کرنا پڑے گا... آئینۂ سخن فہمی کا مطالعہ کرنے والے پر زبان و بیان کے بہت سے اسرار کھل جاتے ہیں۔ کتاب میں ایک ایسی دلچسپی ہے کہ جس کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کا ایک عنوان "نکات سخن" ہے' جس میں ہماری شاعری کے مصنف نے معترض یا نقاد کی لفظی اور معنوی غلطیوں کی گرفت کی ہے اور اصلاح دی ہے۔ یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔"

قومی آواز لکھنؤ ۲۳ مئی سنہ ۱۹۶ء

"پروفیسر سید مسعود حسن کی کتاب ہماری شاعری اردو تنقید کے موجودہ سرمائے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک زمانے میں جناب یگانہ سوامی

نے جو ایک اچھے شاعر اور ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی رایوں کے اظہار میں یک گونہ شدت اور بے اعتدالی سے کام لیتے تھے، کتاب مذکور پر اعتراضات کیے تھے جو جوہر آئینہ اور منظر آئینہ کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ ان کے جواب میں پروفیسر صاحب نے متعدد مضامین لکھے تھے جن میں سے اکثر ملک کے موقر رسائل میں نکلے تھے۔ اب وہی مضامین کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، ان میں۔۔۔۔ شاعری سے متعلق بہت سی کام کی باتیں ملتی ہیں جو نہایت شستہ و شائستہ انداز اور مفصل و مدلل پیرائے میں بیان کی گئی ہیں ممکن ہے کہ کوئی شخص پروفیسر موصوف کی بعض رایوں سے اختلاف کرے لیکن ان کی سخن فہمی میں شبہ نہیں کر سکتا۔ ہمیں امید ہے کہ آئینہ سخن فہمی اپنی افادیت کے پیش نظر اہل ذوق کے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔"

(ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۶۲ء)

تذکرۂ گلشن سخن

۲:

میر کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا

اس تذکرے کا ایک ناقص الطرفین قلمی نسخہ مسعود صاحب کو لکھنؤ میں ملا۔ موصوف نے 'شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ' کے عنوان سے ایک مضمون دسمبر ۱۹۳۳ء کے رسالے 'ہمایوں' لاہور میں شائع کر کے اس کا پہلی مرتبہ تعارف کیا۔ اس کے چند سال بعد مولوی عبدالحق نے تذکرے کو مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں تھا، جس کو لائبریری کے فاضل مہتم عرشی صاحب کے لفظوں میں 'نہایت بدخط اور غلط نویس کاتب نے نقل کیا ہے'۔ مسعود صاحب کی

خواہش کے مطابق عبدالحق صاحب نے اس کی نقل حاصل کرکے مارچ ۱۹۴۳ء میں ان کے پاس بھیج دی۔ رامپوری نسخہ بظاہر کامل لیکن درحقیقت نہایت ناقص ہے۔ اس میں شاعروں کے حالات اور ان کے اشعار میں بہت کمی کردی گئی ہے۔ اس کی نقل جو عبدالحق صاحب سے ملی اس کے کاتب نے اصل ناقص نسخے کو اور زیادہ ناقص کردیا۔ شعرا کے حالات میں اختصار اور اشعار میں کمی کے علاوہ بہت سے شاعروں کا حال حذف کردیا۔ ان ناقص نسخوں کے باہمی مقابلے سے مسعود صاحب نے امکان کی حد تک تذکرے کو مکمل کرکے ایک مبسوط تحقیقی مقدمے اور کئی فہرستوں، انڈکسوں اور اشاریوں کے ساتھ مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔

گلشن سخن میں ۷۱۳ شاعروں کا ذکر ہے اور مبتلا نے تذکرہ نگاروں کی عام روش کے خلاف غزل گویوں کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، ساقی نامہ اور مرثیہ کہنے والوں کا حال بھی لکھا ہے اور بعض لوگوں کی نثر نگاری کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگلے تذکرہ نویسوں میں اکثر نے شعر کو غزل میں محدود اور مرثیے کو شعر کے حدود سے باہر کردیا ہے۔ ان کے یہاں بعض شاعروں کے بارے میں اس طرح کے فقرے ملتے ہیں "بیشتر مرثیہ امام حسینؑ می گفت گاہ گاہ شعر ہم می گفت"۔ لیکن مبتلا نے ایسے متعدد شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے غزل سے زیادہ مرثیے میں نام پیدا کیا۔

تبصرہ

"جناب ادیب نے متن کی تیاری میں جو محنت کی ہے اس کی داد کچھ وہی دے سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے کاموں کا تجربہ ہے۔ انھوں نے اس تذکرے پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جس سے مصنف کے حالات اور تذکرے کی خصوصیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔۔۔ اس تذکرے میں صرف ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ فاضل مرتب

نے اس پر توجہ نہیں کی ۔ اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو صاحبِ تذکرہ کی بہت سی غلط بیانیوں کی تصحیح ہو سکتی تھی "

(سہ ماہی اردو، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۳۳-۱۳۱)

فائزؔ دہلوی اور دیوانِ فائزؔ

طبع اول ۔ عمدہ پریس، دہلی ۱۹۴۶ء

طبع دوم ۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۵ء

اردو شعرا کے تذکرہ نگار اور اردو ادب کے مورخ فائزؔ کے نام تک سے ناواقف تھے ۔ ادیب نے ان کی بائیس تصنیفیں ڈھونڈھ نکالیں ۔ تلاش و تجسس کے اس کارنامے کی مثال ملنا مشکل ہے ۔ اس کتاب کی تالیف و ترتیب جن مرحلوں سے گزری ان کا بیان اربابِ تحقیق کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ ان مرحلوں کی سرگزشت خود مصنف کی زبان سے سنیئے :

"کوئی بیس برس ہوئے کہ فائزؔ کا ضخیم کلیات مجھ کو پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے مستعار ملا ۔ اس میں کلیات کے مبسوط عالمانہ خطبے اور ضخیم فارسی دیوان کے ساتھ مختصر اردو دیوان بھی شامل تھا ۔ فائزؔ کے خطوط کا مجموعہ رقعات الصدر بھی کلیات کے ساتھ مجلد تھا ۔ کلیات اور رقعات پر ایک نظر ڈالنے سے فائزؔ کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ ہوا اور میں نے ان کو اردو دنیا سے روشناس کرنے کا تہیہ کر لیا ۔ کلیات کے مالک کو کچھ معاوضہ دے کر اس کا وہ حصّہ نقل کر لیا جو اردو کلام پر مشتمل تھا اور پورے کلیات پر نظر کر کے کچھ یادداشتیں لکھ لیں اور چند ضروری اقتباس لے لیے " ص ۹

"کچھ زمانے کے بعد فائزؔ کے چند رسالے دستیاب ہوئے اور ان یادداشتوں،

اقتباسوں اور رسالوں کی مدد سے میں نے فائز اور ان کی شاعری پر ایک مقالہ لکھا۔"

صہ ۹-۱۰

"اس کے بعد فائز کی بعض تصنیفیں وقتاً فوقتاً ملتی رہیں۔ ان کتابوں کی دستیابی کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ فائز کی کل تصنیفوں پر گہری نظر ڈال کر اور اس مقالے میں ضروری اضافے کر کے اُسے کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے اور اسکے ساتھ فائز کا اردو دیوان مع فرہنگ اور حاشیوں کے شامل کر دیا جائے۔"

صہ ۱۰

اس اثنا میں کلیات فائز جامعہ ملیہ کے کتب خانے میں داخل ہو گیا۔
"گورنمنٹ آف انڈیا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معائنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کا ایک ممبر میں بھی مقرر ہوا۔ مارچ ۱۹۴۲ء کے تیسرے ہفتے میں میں اس غرض سے دہلی پہنچا اور پانچ دن جامعہ نگر میں قیام کیا۔ اس سفر سے میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ یعنی کلیات فائز کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع مل گیا۔"

صہ ۱۰

"دہلی سے واپسی کے کوئی پونے دو مہینے بعد فائز کا کلیات میرے پاس پہنچ گیا اور میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ دس پندرہ دن میں کام ختم ہو جائے گا۔ مگر تحقیق اور تلاش کے نئے نئے راستے پیدا ہوتے گئے۔ کلیات کو بار بار پڑھنا پڑا اور دنوں کی جگہ مہینے لگ گئے۔ فائز کی دوسری تصنیفوں کا بھی حرف حرف جس غور سے پڑھا گیا ہے اس کا کچھ اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہو جائے گا۔ مگر فائز کے خاندان کی کڑیاں جوڑنے میں جو دقتیں پیش آئیں اور اس کے لیے جتنی محنت کرنا پڑی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

صہ ۱۰-۱۱

"فائز کے اردو دیوان کی قرأت، تصحیح اور تحشیہ بھی اچھا خاصا صبر آزما کام نکلا۔ متروک اور نامانوس الفاظ کے علاوہ ان کے رسم خط کی بعض خصوصیتوں نے اس کا پڑھنا دشوار کر دیا تھا۔ بڑی دیدہ ریزی اور مغز کاری کے بعد بھی چند لفظ صحیح نہیں پڑھے جا سکے۔ اسی طرح انتہائی کوشش کے باوجود چند لفظوں کا مفہوم معلوم نہیں ہو سکا۔" ص ۱۱

"فائز کے حالات اور تصنیفات کی تلاش، ان کی تصنیفوں اور نظموں کا غائر مطالعہ، ان کے دیوان کے متن کی صحیح قرأت، تشریح طلب مقامات پر حاشیے اور مشکل الفاظ کی فرہنگ" یہ سب کام انجام دینے میں ایک مدت گزر گئی اور کوئی بیس برس تک یہ موضوع پیش نظر رہا۔ آخر تمام مرحلوں سے گزر کر ۱۹۴۵ء میں ایک کتاب ذیل کے طولانی نام سے مرتب ہوئی شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر نواب صدر الدین محمّد خاں فائز دہلوی اور اس کا دیوان۔" ص ۱۲-۱۳

اس کتاب کو انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی نے ۱۹۴۶ء میں چھاپ کر شائع کر دیا۔ کتاب میں ماخذوں اور مضمونوں کی فہرستیں شامل نہیں کی گئی تھیں۔ اس لیے مصنف نے اس کی اشاعت رکوا دی۔ اس اثنا میں دہلی کے قیامت خیز فرقہ وارانہ فسادات میں انجمن ترقی اردو کا ذخیرۂ کتب بھی لٹ گیا اور اس کتاب کے تقریباً کل نسخے ضائع ہو گئے۔ ایک مدّت کے بعد جب انجمن کی از سر نو تنظیم کی گئی تو مصنف نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اور بہت سے اضافوں کے ساتھ دوبارہ اس کو مرتب کر کے "فائز دہلوی اور دیوان فائز" اس کا نام رکھا۔ یہ دوسرا ایڈیشن انجمن نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔

"کتاب کے اس ایڈیشن میں اضافوں کے علاوہ فائز کے حالات میں

مضمونوں کی اور دیوان میں نظموں کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے اور حسب ذیل چار نادر چیزوں بلاک شامل کر دیے گئے ہیں: ۱۔ تصویر فائز مع عمائد بارگاہ۔ ۲۔ مکتوب امیر الامرا صمصام الدولہ خان دوراں خان بہادر بنام فائز بخط امیر الامرا۔ ۳۔ مکتوب برہان الملک سعادت خان بانی سلطنت اودھ بنام فائز بخط برہان الملک۔ ۴۔ تحریر زبدۃ النسا بنت زبردست خاں خواہر فائز۔ ص۱۵

دیوان فائز کے متن کی ترتیب، تکمیل اور تصحیح میں جامعہ ملیہ کے نسخے کے علاوہ باڈلین لائبریری آکسفورڈ کے نسخے کی نقل حاصل کر کے اس سے بہت مدد لی گئی ہے۔

جناب ادیب فائز کو شمالی ہند میں اردو کا سب سے قدیم صاحبِ دیوان شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ میر جعفر زٹلی کو فائز سے کچھ قدیم تر مانتے ہیں مگر سنجیدہ شاعروں میں ان کا شمار نہیں کرتے۔ ان کی تائید میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جعفر کے مجموعۂ کلام پر دیوان کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ دیوان مجموعۂ غزلیات کو کہتے ہیں۔ جن شاعروں کے مجموعۂ کلام میں غزلیات کے ساتھ قصائد، مثنویات، رباعیات وغیرہ شامل ہیں ان کو بھی دیوان کہہ دیتے ہیں۔ مگر کسی کا مجموعۂ کلام جس میں غزلیں شامل نہ ہوں دیوان کے حدود میں نہیں آتا۔ جعفر کے کلام میں نہ کوئی غزل ہے نہ قصیدہ، اس کو دیوان کہنا مشکل ہے۔

تبصرے

اردو کے وسیع المعلومات محقق اور سخت گیر محتسب قاضی عبدالودود کے بارے میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب لکھتے ہیں:

"تبصروں میں کبھی ان سے بالکل نہیں ہوتی اور رواج زمانہ کے خلاف تعریفی کلمات بہت کم لکھتے ہیں۔ جن کتابوں پر آج تک انھوں نے تبصرے لکھے ہیں

جس کی ترتیب و تصحیح جناب مسعود حسن رضوی ادیب نے کی ہے۔ مختلف صحبتوں میں اس کتاب کا ذکر آیا اور ہمیشہ انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں کتاب کی تصحیح و ترتیب کا ذکر کیا۔ بایں ہمہ جب انھوں نے معاصر میں اس پہ تبصرہ لکھا تو تعریف میں صرف ڈھائی سطریں لکھیں۔"

نقوش، لاہور، شخصیات نمبر ضمیمہ ص ۳۱۸

وہ ڈھائی سطریں حسب ذیل ہیں:

"فاضل مرتب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے، وہ اس قسم کی اور کتابوں میں جو انجمن نے شائع کی ہیں، بہت کم ملتا ہے۔ ترتیب کا یہ بلند معیار قابل تقلید ہے۔" (معاصر حصہ ۱، ص ۱۸۱)

اسی کتاب کے بارے میں قاضی صاحب موصوف نے دوبارہ تحریر فرمایا ہے:

"یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہیں، ان میں بہت کم ایسی ہیں جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے..... کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔" (عیارستان ص ۱)

صفدر آہ:

"تقریباً ۱۹۲۰ء میں جب دیوان فائز ادیب صاحب کو ملا ہے اس وقت علمی اور ادبی دنیا میں فائز کے متعلق مجموعی معلومات شاید چند سطروں سے زیادہ نہ تھی لیکن اس دیوان کے ضخیم مقدمے میں ادیب صاحب نے معلومات کا ایک سمندر بھر دیا ہے..... فائز کے متعلق درجنوں بے حد اہم مباحث موجود ہیں، ساتھ ہی فائز کی قدیم زبان کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے۔ (ماہنامہ کتاب لکھنؤ ۱۹۶۸ء)

صباح الدین عبد الرحمن :

"انجمن (ترقی اردو) نے نواب صدر الدین فائز کا دیوان پروفیسر مسعود حسن رضوی کے محققانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ پروفیسر صاحب فائز کو شمالی ہند میں اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے فائز کی دوسری تصانیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔"

(ماہنامہ 'آجکل'، دہلی، اردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء)

ایرانیوں کا مقدس ڈراما

الواعظ سفد ر پریس لکھنؤ جنوری ۱۹۶۶ء

ماخذوں کی تعداد ۲۷

تصویریں: ۱۔ تہران کا شاہی تکیہ

۲۔ مرزا غلام حسین حضرت عباس کی شبیہ پیش کر رہے ہیں

یہ کتاب بھی پروفیسر رضوی کے ادبی تحقیق میں بے لوث انہماک اور انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر نہ کسی ایرانی مصنف نے تحقیق کی زحمت گوارا کی تھی نہ کسی یورپی مستشرق نے۔ مصنف کتاب نے ہندوستانی، برطانی، امریکی، فرانسیسی اور جرمن سیاحوں کے سیاحت ناموں اور مورخوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جن کتابوں میں ان کو اپنے موضوع سے متعلق کچھ مواد ملا ہے ان ماخذوں کی توضیحی فہرست کتاب کے شروع میں لگادی ہے۔ جو کتابیں فرانسیسی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں ہیں، ان میں سے بیشتر کے انگریزی ترجمے پڑھ کر اور بعض کا ترجمہ اپنے ذی علم احباب کی زبان سے سن کر اپنے کام کی باتیں اخذ کر لیں۔ ان غیر ملکی سیاحوں اور مصنفوں نے اس ایرانی مذہبی ڈرامے کے چشم دید حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

فاضل مصنف نے کتاب کی ابتدا میں تعزیہ، شبیہہ گردانی، تکیہ، پیشن، مریکل، مسٹری (PASSION, MIRACLE, MYSTERY) کی اصطلاحوں کی وضاحت کردی ہے۔ جن ہندوستانی ادیبوں نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے انھوں نے ان لفظوں کے اصطلاحی مفہوم سے ناواقفیت کے باعث ان کے لغوی معنوں سے دھوکا کھایا ہے۔ مثلاً PASSION PLAY کا ترجمہ جذباتی تمثیل اور MIRACLE PLAY کا معجزاتی تمثیل کیا ہے، حالانکہ یہاں نہ پیشن کے معنی ہیں جذبہ نہ مریکل کے معنی ہیں معجزہ۔ اسی طرح ہندوستان میں لفظ 'تعزیہ' سے مراد ہے امام حسین کے روضے کی نقل، مگر ایران میں اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہے، یعنی واقعات کربلا کو ڈرامے کی طرح اسٹیج پر پیش کرنا۔ اس معنی میں تعزیہ یعنی ایرانیوں کا مقدس ڈراما اس کتاب کا موضوع ہے اور یہ کتاب اس موضوع پر ایک منفرد اور معتبر دستاویز ہے۔ اس کے مطالعے سے اس خاص نوعیت کے ایرانی ڈرامے کی ابتدا، ترقی اور تنزل کا مفصل حال، اس کے لیے اسٹیج کی ترتیب، اداکاروں کی پوشاکیں، اداکاری کے غیر معمولی کارنامے اور ترقی یافتہ ملکوں کے عینی شاہدوں کے تاثرات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔

تعزیہ کے اداکاروں کے لیے تعزیہ نامے یعنی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی جاتی تھیں جن میں منظوم گفتگوئیں، مکالمے اور تقریریں درج کی جاتی تھیں جن کو یاد کر کے وہ اسٹیج پر سناتے تھے۔ ذیل میں زیر تبصرہ کتاب کے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں، جن سے تعزیہ ناموں کے بارے میں تفصیلی اطلاع مل جاتی ہے۔

> "تعزیوں کا رواج کم سے کم ڈیڑھ سو برس قائم رہا اور ہر سال ایران کے طول و عرض میں ہر جگہ نئے نئے تعزیے دکھائے جاتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ ہزارہا تعزیہ نامے تصنیف کیے گئے ہوں گے مگر وہ سب وقتی چیزیں تھیں جن کو باقی رکھنے کی کسی کو فکر نہ تھی۔"

"تعزیوں کے حالات کی طرح تعزیوں کے کتابچوں کی فراہمی، تحفظ اور اشاعت بھی غیر ملکی لوگوں کا کارنامہ ہے۔"

"پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ وہ کتابچے جن میں وہ الفاظ بجنسہٖ درج ہوتے ہیں جو اداکار تعزیوں میں بولتے ہیں اکثر دستیاب نہیں ہوتے ہیں اگرچہ ان کے چھپے ہوئے نسخے موجود ہیں۔"

"سنہ ۱۹۳۲ء میں گرمی کے موسم میں راقم الحروف نے کوئی تین مہینے ایران کے مختلف شہروں میں صرف کیے اور چونکہ ایک مدت سے تاریخ مرثیہ کے لیے سامان جمع کرنے کی فکر تھی۔ اس لیے فارسی مرثیوں کی فراہمی بھی سفر کے مقاصد میں داخل تھی۔ اس سلسلے کی جو کتابیں مجھے دستیاب ہوئیں، ان میں آٹھ عدد کتب تعزیہ بھی ہیں۔"

"ان کتابوں میں سے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کی تاریخی ادبی، اور تمثیلی حیثیت وغیرہ کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔"

ایک مدت کے بعد تعزیوں کے رواج کے ساتھ تعزیہ ناموں کی تصنیف کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ علمائے مذہب کو تعزیے سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن ان کی مخالفت تعزیے کی مقبولیت پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ فاضل مستشرق کاونٹ گوبی نو جو قاچاری عہد میں سفیر فرانس کی حیثیت سے ایک مدت تک تہران میں مقیم رہا، لکھتا ہے:

"علما کی مخالفت کے باوجود یہ ڈرامے ایکٹروں اور پبلک کے تخیلات اور احساسات کے زور سے پھیلتے اور نئے نئے اضافے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مقدس تشبیہیں اس قدر مقبول اور عام پسند ہیں کہ تخت نشین بادشاہ سے لے کر کوچہ گرد فقیر تک شاید ملاؤں کے سوا ہر شخص، ان میں شرکت کرتا ہے اور ان کی رو میں بہا چلا جاتا ہے۔"

پروفیسر رضوی نے کتاب کے آخری حصے میں تعزیے کے زوال کے اسباب پر تفصیل

سے بحث کی ہے۔

شاعرِ اعظم انیسؔ

نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۶ء

یہ تین جزء کا کتابچہ یادگار انیسؔ کمیٹی لکھنؤ نے فراہمیِ سرمایہ کا ایک ذریعہ قرار دے کر شائع کیا تھا اور اس کی قیمت یوں رکھی تھی کم سے کم دو روپے، زیادہ سے زیادہ حسبِ توفیق۔ اس کے کور پر سامنے کے رخ پر میر انیسؔ کا اور پشت کی طرف نو تعمیر مزارِ انیسؔ کا بلاک ہے۔ اس کے اہم عنوانات یہ ہیں، میر انیس: مختصر تعارف؛ میر انیس کی شاعری: ممتاز اہلِ قلم کا خراجِ تحسین؛ شاعر کی خود شناسی؛ انیسی لٹریچر؛ اشخاصِ مرثیہ کا مختصر تعارف؛ منتخباتِ کلامِ انیس۔ آخری عنوان کے تحت چودہ رباعیاں، بارہ سلاموں کے منتخب اشعار اور مرثیوں کے ستائیس اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ بعض اقتباسات تلخیص کے بے مثال نمونے ہیں مثلاً پچپن بند کے مرثیے "آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے" کا مطلع سے مقطعے تک خلاصہ صرف گیارہ شعروں میں اور بیالیس بند کے مرثیے "آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں ہے" کے ابتدائی بیس بندوں کا خلاصہ صرف آٹھ شعروں میں اس طرح کہ نہ بیان کا کوئی موثر گوشہ چھوٹنے پایا نہ کلام کے تسلسل میں فرق آیا، بلکہ مزید برآں بیان کے زور اور کلام کے اثر میں اضافہ ہو گیا۔ سرسری نظر سے تلخیص کے اس کمال کا یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ تنقیدی شعور کے ساتھ ملخص کلام کا مفصل کلام سے مقابلہ کیا جائے۔

مولف کتابچہ کے معیارِ انتخاب اور حُسنِ ترتیب کے لیے دو عنوانوں پر نظر کر لینا کافی ہے یعنی حُسینیوں کے نورانی چہرے اور بے مثال سواروں کے بے نظیر

گھوڑے۔

آخر میں "معروف ناشر" کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اس کتابچے کی نوعیت پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے:۔

"اس کی ترتیب جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انیس کی سیرت، شخصیت اور کمال مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی وغیرہ کو اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش نظر کر دیا ہے کہ گویا کوزے میں دریا بھر دیا ہے۔ کلام انیس کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ ان کے شاعرانہ کمال کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر رہے ہیں۔"

قواعد کلیۂ بھاکھا

برج بھاشا کی قدیم ترین گرامر

نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

ایک نہایت اہم غیر مطبوعہ کتاب "تحفۃ الہند" پر پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ایک تعارفی مضمون ماہنامہ ادب لکھنؤ بابت جون ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ پھر ۱۹۳۳ء میں سنسکرت کے نامور عالم الہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پنڈت گنگا ناتھ جھا کو پیش کی جانے والی یادگاری کتاب (JHA COMMEMORATION VOLUME) کے لیے اسی کتاب پر ایک مضمون انگریزی میں لکھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس کتاب کے ایک حصے کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے "برج بھاشا کی پہلی گرامر" کے عنوان سے رسالہ "نقوش" لاہور کے ایک خاص نمبر میں شائع کیا۔ اس رسالے کی گزشتہ اشاعتوں سے منتخب کر کے اہم مضامین کا مجموعہ "ادب عالیہ نمبر" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا گیا اور اس میں مسعود صاحب کا یہ مضمون بھی شامل

کیا گیا۔ وہی مضمون ایک مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا جو اس وقت راقم حروف کے پیش نظر ہے۔

تحفۃ الہند کے دو قلمی نسخے مسعود صاحب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔۔۔ ایک میں دیباچہ مختصر ہے، دوسرے میں طویل۔ مختصر دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کوکلتاش خاں کی فرمائش پر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے مطالعے کے لیے اہل ہند کے علوم متداولہ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ طولانی دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اورنگ زیب کے پوتے بادشاہ زادہ معز الدین جہاندار شاہ کے لیے لکھی گئی۔ مسعود صاحب نے بڑی مضبوط اور ناقابل تردید دلیلوں سے ثابت کر دیا ہے کہ مختصر دیباچہ مصنف کا اصل دیباچہ ہے جس میں بعد کو بہت سا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

تحفۃ الہند کے مصنف کا نام ایک قلمی نسخے میں میرزا محمد ابن فخر الدین محمد ہے اور دوسرے نسخے میں میرزا خان ابن فخر الدین محمد ہے۔ پیش نظر کتاب کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود صاحب کے کتب خانے میں قصائد عرفی کی ایک شرح مفتاح النکات کے دو قلمی نسخے ہیں۔ مصنف کا نام میرزا جان اور زمانہ تصنیف ۱۰۷۳ھ عہد عالمگیر ہے۔ ممکن ہے کہ تحفۃ الہند کا مصنف میرزا خان اسی میرزا جان کا بھائی ہے۔ اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا صحیح نام میرزا خان ہو۔

تحفۃ الہند میں ایک مقدمہ سات باب اور ایک خاتمہ ہے۔ ابواب کے موضوعات کی تفصیل یہ ہو۔ (۱) پنگل یعنی علم عروض (۲) تُک یعنی علم قافیہ (۳) النکار یعنی علم بیان و بدیع (۴) سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی (۵) سنگیت یعنی علم موسیقی (۶) کوک یعنی عورتوں اور مردوں کے اقسام اور ان کی باہمی معاشرت کا علم (۷) سامدریک یعنی علم قیافہ شناسی۔ خاتمہ کتاب میں اہل ہند کے لغات و مصطلحات و کنایات ہیں یعنی وہ ہندی زبان کی قدیم فرہنگ ہے۔ باب سوم میں عیوب کلام

کا بیان بھی ہے، جن کی تعداد ۱۲۰ ہے۔

مصنف ہر اصلاح کے ساتھ اس کا عربی مترادف بھی بتاتا ہے اور مثالوں میں ہندی شعروں کے ساتھ بیشتر فارسی کے شعر اور فقرے بھی لکھتا ہے۔ اس طرح وہ ہندی زبان اور ہندی شاعری کو فارسی دانوں سے قریب تر کر دیتا ہے۔

مقدمہ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں دیوناگری حروف اور رسم الخط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے حصے میں بھاکھا کے قواعد کلیہ ہیں۔ مصنف خود کو ان قواعد کا مخترع کہتا ہے یعنی اس کا دعویٰ ہے کہ بھاکھا یعنی برج بھاشا کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مسعود صاحب کا بیان ہے:۔

"میں نے ہندی کے مستند عالموں سے رجوع کیا مگر وہ اس سے پہلے کی لکھی ہوئی برج بھاشا کی کسی گرامر کا نام نہ بتا سکے۔ بظاہر مصنف کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے۔ اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔ اس سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔"

پیشِ نظر کتاب مقدمہ تحفۃ الہند کے اسی دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔

بزمِ سُلیمان

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے منشی خادم حسین افسوس کا تصنیف کیا ہوا ناٹک بزمِ سلیمان اپنے تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے رسالہ نقوش لاہور کے اگست ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع کیا۔ امانت لکھنوی کا ناٹک اندر سبھا اور اس کا کھیل اس قدر مقبول ہوا کہ اسی طرز کے بہت سے ناٹک لکھے گئے جو تھوڑی مدت کے بعد

منظوم ہوتے رہے۔ ایسے تقریباً بیس ناٹکوں کا ذکر مسعود صاحب کی کتاب "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" میں ملتا ہے۔ ان میں صرف تین ناٹک زیادہ دن تک زندہ رہے، "ماہ منیر معروف بہ اندر سبھا مداری لال"، "بزم سلیمان مصنفہ خادم حسین افسوس" اور "جشن پرستان" مصنفہ بھیروں سنگھ عظمت۔ مداری لال کی اندر سبھا نے سب سے زیادہ عمر پائی اور بہت دفعہ چھاپی گئی۔ باقی دو ناٹک صرف ایک ایک مرتبہ چھپ کر نایاب ہو گئے۔

جشن پرستان مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۷۳ فصلی میں چھپا۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں اور اس کی خوش خط نقل مسعود صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ بزم سلیمان مطبع ابد بہ کاشی میں چھپا، سال طبع درج معلوم نہیں۔ اس کا ایک نسخہ مسعود صاحب کے کتب خانے میں ہے اور غالباً اس کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کا موجود نسخہ مرتب کے الفاظ میں "اس قدر خستہ اور شکستہ ہے اور اس کی کتابت کا انداز ایسا ہے کہ اس کو صحیح پڑھنا اور اس کے اشعار کو صحیح ترتیب سے نقل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔" اس لیے مرتب نے بہت دیدہ ریزی کے ساتھ پہلے اس کو خود نقل کیا پھر کاتب سے لکھوایا۔

بزم سلیمان کے مقدمے میں اس کے مصنف کا تعارف یوں کیا گیا ہے:-

"منشی خادم حسین کے حالات زندگی معلوم نہیں۔ ان کی نظم و نثر تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معمولی استعداد کے ذہین آدمی تھے ..... موسیقی میں دخل رکھتے تھے اور گیت بنانے اور ان کی دھنیں رکھنے پر قادر تھے .... ان کے قلم سے نکلی ہوئی چیزیں جو میرے علم میں آئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے چھ قطعات تاریخ، اکیس[۲] گیت، پریم ساگر کا خاتمہ اور ناٹک بزم سلیمان "

افسوس کے قطعات تاریخ مقدمے میں درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ قطعات ۱۲۷۸ھ سے ۱۲۹۹ھ تک اکیس[۲] برس میں کہے گئے ہیں۔ ان سے افسوس کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔

حکیم رضا محمد صہبا ابن حکیم رضا حسین شہہا نے گیتوں کی ایک کتاب نغمۂ سرود کے نام سے ۱۲۷۶ھ میں نقل کی۔ قاعدۂ نغمہ اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کتاب کے تین حصے یکجا دوسری بار مرتبہ مطبع گلزار محمدی لکھنؤ میں سنہ ۱۳ھ میں چھپے تھے۔ اس کے تیسرے حصے میں افسوس کے اکیس گیت شامل ہیں، چار ٹھریاں، چھ بسنت، پانچ ہولیاں، پانچ ساون اور ایک چوماسہ۔ نغمہ سرود کا ایک نسخہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ میں موجود ہے۔

منشی شنکر دیال فرحت نے پریم ساگر کا منظوم ترجمہ مثنوی کی شکل میں ۱۲۸۰ھ میں تمام کیا۔ اس کا خاتمہ جو افسوس کی نثر نگاری کا اچھا نمونہ ہے مقدمے میں نقل کر دیا گیا ہے یہاں اس کا ابتدائی حصہ درج کیا جاتا ہے:

"ان دنوں شنکر دیال فرحت خلف منشی پورن چند نے ترجمہ پریم ساگر بھاکا سے زبان اردو میں نہایت دلچسپ و دل پسند کیا، قلزم ذخار او بحر ناپیدا کنار کو کوزے میں بند کیا۔ مضمون راست براست بے کم و کاست، اور کا اور نہیں۔ مثل دیگر کتب مترجمہ حال فسانے کا انداز مثنوی کا طور نہیں۔ اسمائے مقدسہ کے بیشتر لفظ دشری، موجود ہے۔ اس صورت میں یہ کتاب تحفہ ہنود ہے۔ مطبع کی صنعت اظہر من الشمس ہو، حاجت اظہار نہیں۔ مضمون صاف حرف شفاف ہیں، تشریح درکار نہیں۔"

افسوس نے ناٹک بزم سلیمان امانت کی اندر سبھا کے دس برس بعد ۱۲۸۰ھ میں لکھا اور اس کے تمام جزئیات و تفصیلات میں اندر سبھا کی پیروی کی۔ لیکن ان دونوں ناٹکوں کے کردار یکساں نہیں ہیں۔ اندر سبھا میں جو کردار راجا اندر اور سبز پری کا ہے، بزم سلیمان میں وہی کردار پریوں کے افسر سلیمان شاہ اور یاقوت پری کا ہے۔ قصے کا پلاٹ دونوں ناٹکوں میں بالکل ایک سا ہے۔ جن حالات میں سبز پری شہزادہ گلفام پر عاشق ہوتی انھیں حالات میں یاقوت پری شہزادہ گل اندام پر عاشق ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سب کچھ وہی ہوتا ہے جو اندر سبھا میں ہوا۔ دونوں ناٹکوں کا خاتمہ مبارکباد کی غزل پر ہوتا ہے۔

بزم سلیمان کے بارے میں عشرت رحمانی اور امتیاز علی تاج صاحبان کو جو غلط فہمیاں ہوئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ عشرت رحمانی کا مقالہ اردو ڈرامے کی ایک صدی 'ادب لطیف' لاہور۔ ڈراما نمبر اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے ایک ناٹک کا نام 'جشن پرستان عرف بزم سلیمان' بتایا ہے اور امتیاز علی تاج کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصنف اودھ کے ایک شاعر حیدر تھے اور اس ناٹک کا ایک نام بزم سلیمان بھی ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ بزم سلیمان کے مصنف میر شبیر علی افسوس ہیں۔

پروفیسر رضوی لکھتے ہیں "جشن پرستان اور بزم سلیمان کو ایک ناٹک کے دو نام سمجھنا ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے جو ہر ایسے شخص کو ہو سکتی ہے جس نے نہ جشن پرستان کو دیکھا ہو نہ بزم سلیمان کو اور جو 'جشن پرستان عرف بزم سلیمان' کے سے دہرے ناموں کی حقیقت سے ناواقف ہو۔"

ناٹکوں کے دہرے نام پرانے زمانے کی بات ہے جس سے اس وقت کے بیشتر ادیب ناواقف ہیں۔ مسعود صاحب نے اس کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب بمبئی کے کچھ پارسیوں نے تھیٹر کی کمپنیاں قائم کر کے اردو ڈراموں کے لیے باقاعدہ اسٹیج مہیا کیا تو ابتدا میں اس کے لیے مشہور قصوں اور مثنویوں سے ڈرامے تیار کیے گئے اور مقبول ناٹکوں میں ترمیم و تنسیخ حذف و اضافہ کر کے ان کو نئے اسٹیج کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا۔ یہ ترمیم کیے ہوئے ناٹک دہرے ناموں سے اپنے ترتیب دینے والوں کی طرف منسوب کیے گئے۔ مثلاً 'ذخیرۂ عشرت معروف بہ اندر سبھا امانت' مصنفہ حافظ محمد عبداللہ اور 'نیرنگ قاف معروف بہ غزالہ ماہ رو' مصنفہ محمد الف خان

جاب۔ ذخیرۂ عشرت امانت کی اندرسبھا پر مبنی ہے اور نیرنگ قاف واجد علی شاہ کی مثنوی دریائے تعشق سے ماخوذ ہے، جس کے قصے میں غزالہ اور ماہ رو کی حیثیت ہیروئن اور ہیرو کی ہے۔

" اس کی ایک مثال 'جلسۂ پرستان عرف بزم سلیمان' مولفہ محمد عبدالوحید قیس بھی ہے۔ یہ بزم سلیمان مصنفہ افسوس کی ترمیم شدہ صورت ہے اور اس کا دہرا نام یہ بتاتا ہے کہ موجودہ صورت میں اس ناٹک کا نام جلسۂ پرستان ہے، مگر اصل کتاب جس کو ترمیم کر کے یہ صورت بنائی گئی ہے اس کا نام بزم سلیمان ہے۔ مولفہ محمد عبدالوحید قیس کا مطلب یہ ہے کہ بزم سلیمان کو ترمیم کر کے جلسۂ پرستان کی صورت میں لانے والے محمد عبدالوحید قیس ہیں۔ 'جشن پرستان عرف بزم سلیمان' مولفہ حیدر بھی اسی قیاس پر بزم سلیمان کی ترمیم شدہ صورت معلوم ہوتی ہے اور ترمیم کرنے والے کوئی شاعر حیدر ہیں۔

عبدالوحید نے اصل مصنف کا تخلص ہر جگہ سے نکال دیا ہے۔۔۔۔جس شعر پر کتاب ختم ہوتی ہے وہ اصل کتاب میں یوں تھا:

خوب مشہور جہاں آپ ہوئے اے افسوس
شاعروں میں تمھیں اب نام مبارک ہووے

قیس نے کتاب میں ترمیم کرنے کے بعد اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'افسوس' کی جگہ اپنا تخلص ڈال کر اس کو یوں بنا دیا 'خوب مشہور جہاں ہو گئے تم تو اے قیس'۔ اب یہ غلط فہمی آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے کہ قیس اصل ناٹک کا مصنف ہے۔"

"تاج صاحب لکھتے ہیں" یہ بات غلط ہے کہ بزم سلیمان کے مصنف میر شیر علی افسوس ہیں"۔ بیشک یہ بات غلط ہے، مگر یہ غلط بات کہی کس نے۔ ممکن ہے کہ افسوس تخلص دیکھ کر کسی کا ذہن اس تخلص کے مشہور شاعر اور مصنف میر شیر علی کے نام کی طرف

نقل ہو گیا ہو۔ منشی خادم حسین افسوس نے بزم سلیمان ۱۲۷۸ھ میں لکھی۔ اس وقت میر شیر علی افسوس کے انتقال کو پچاس برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا تھا۔ اس صورت میں کسی کا یہ خیال کہ اس کے مصنف میر شیر علی افسوس ہیں غلط خیالی کی انتہا ہے۔"

نگارشاتِ ادیب

نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۹ء

یہ مسعود صاحب کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف کے کوئی تیس[30] مضمون اور مقالے ان کی کئی کتابوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی رسالوں میں اتنے مضامین بکھرے پڑے ہیں کہ ان سے ایسے ایسے دو تین مجموعے اور مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ریڈیو نشریے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون "نواز اور شکنتلا ناٹک" ہے۔ اس مصنف اور اس کی تصنیف کے بارے میں اتنی غلط بیانیاں ملتی ہیں جتنی کسی دوسرے مصنف اور کسی دوسری تصنیف کے بارے میں نہیں مل سکتیں۔ نواز اور اس کی شکنتلا ناٹک کے بارے میں پندرہ ادیبوں کے بیانات لکھ کر وہ سوالات لکھ دیے گئے ہیں جو ان بیانوں سے پیدا ہوتے ہیں، یعنی نواز کون تھا، اس کی شکنتلا ناٹک کی نوعیت کیا ہے، اس کی زبان کیا ہے، وہ کس کے حکم یا فرمائش سے لکھی گئی، وہ کب لکھی گئی؟ ان پانچ سوالوں کے تیئیس مختلف جواب دیے گئے ہیں۔

ادیب نے اصل کتاب کا مطالعہ کر کے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ کتاب کا نام سکنتلا کتھا ہے۔ وہ ناٹک نہیں ہے، ہندی کی مختلف بحروں میں ایک منظوم قصہ ہے۔ اور اس کا مصنف ایک مسلمان شاعر نواج ہے۔ جس نے نواب اعظم خاں کی فرمائش پر فرخ سیر کے عہد میں ...... شکنتلا ناٹک کا قصہ زبان بھاکھا میں نظم کر دیا ہے۔

اور شکنتلا ناٹک سے کالیداس کا مشہور عالم ناٹک مراد نہیں ہے۔ ہندی کے جن ماخذوں سے صحیح حالات ملنے کی توقع تھی یعنی شیو سنگھ سروج، مشر بندھو ونود، تاریخ ادبیات ہندی، ہندی مخطوطات کا مختصر بیان ان میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ سب بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔

نواج کی زیر نظر کتاب کے مرتب نرملیشور چنتر ویدی نے مقدمۂ کتاب میں نواج کے سرپرست کا نام اعظم خان کوکہ بتایا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا سرپرست اعظم خان کوکہ کا بیٹا محمد صالح خان تھا۔ باپ اور بیٹے دونوں کو مغل بادشاہوں کی سرکار سے مختلف اوقات میں پہلے فدائی خاں اور پھر اعظم خاں خطاب ملا تھا۔ لیکن باپ اورنگ زیب عالمگیر کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اس کے خطاب اعظم کے ساتھ لفظ کوکہ شامل کر دیا گیا تھا۔ خطابوں کی یکسانی سے غلط فہمیاں ہو رہی تھیں۔ ضرورت تھی کہ ان خطاب یافتہ شخصیتوں کے حالات ضروری تفصیلات کے ساتھ لکھ دیے جائیں کہ ایک پر دوسرے کا دھوکا نہ ہو۔ فاضل مضمون نگار نے تاریخ بالخصوص مآثر الامرا کے ضخیم مجلدات کے ہزاروں ورق الٹ کر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

نگار شناخت کے کئی مضمونوں میں ہم قابلِ ذکر غیر معروف شاعروں سے متعارف ہوتے ہیں یعنی رائے ٹیکا رام تسلی شاگرد رنگین و مصحفی، شہید شاگرد ناسخ، یا ورشاگرد شہید، عرش فرزند میر اور کلیم دہلوی اور چند مضمونوں سے بعض مشہور شعرا کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، یعنی آتش کا مذہب، دیوان افسوس کا ایک قدیم نسخہ، امیر مینائی کی دو نایاب کتابیں اور حضرت عروج لکھنوی۔

تین مضمون غالبیات سے متعلق ہیں (۱) مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی (۲) غالب کے دو تعزیت نامے اور چنا جان (۳) مرزا غالب، تب اور اب۔

ایک مضمون میں فارسی اور اردو کا ایک فرانسیسی ادیب اور شاعر مسعود صاحب

گئی ہی دریافت ہے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے ایک معتوب مصاحب پیٹر
فوزبیر نے فرانس کے عظیم مصنف وولٹیر کی ایک کتاب کا ترجمہ فارسی میں اس توقع پر کیا
کہ بادشاہ اس کے صلے میں اس کا قصور معاف کر دیں گے۔ اور اسی مصنف کی دوسری کتاب
کا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ کر کے محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی خدمت میں
پیش کیا۔ اردو ترجمے میں مترجم کے اردو اشعار بھی شامل ہیں۔

ایک مضمون میر کے لطیفوں پر مشتمل ہے۔ میر نے اپنی کتاب ذکر میر کے آخر میں چھبیس
لطیفے لکھ دیے ہیں۔ ذکر میر مرتبہ مولوی عبدالحق میں یہ لطیفے کتاب سے خارج کر دیے
گئے۔ اس مضمون میں تئیس لطیفے جو ہندوستان کے مشاہیر سے تعلق رکھتے ہیں فارسی سے
اردو میں ترجمہ کر کے پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان لطیفوں سے متعلقہ اشخاص کے بارے میں ہماری
معلومات میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک مضمون میں انیس و دبیر کے ہم عصر اور حریف مرثیہ گو میر عشق کے حالات زندگی
کے ساتھ اصلاح زبان میں ان کا ایک کمیاب رسالہ پیش کیا گیا ہو۔

ایک بلند پایہ علمی مقالے کا موضوع مولانا جامی کے شاگرد عطاء اللہ بن محمود الحسینی
کا رسالہ قافیہ ہے، جو ۹۲۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس رسالے اور اس کے مصنف کے بارے
میں جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہے اور فارسی لفظوں کے آخر میں دال مہملہ اور ذال معجمہ کا
محل استعمال اور ایرانیوں کے موجودہ لہجے سے واو مجہول اور یائے مجہول کا اخراج
ان مسئلوں سے جو تفصیلی بحث کی گئی ہے وہ ذیل کی قدیم کتابوں سے ماخوذ ہے:۔

صنائع الحسن از فخری ابن امیری، بابر نامہ از بابر بادشاہ، معیار الاشعار از نصیر
الدین محقق طوسی، حدائق عجم یا العجم فی معاییر اشعار العجم، تکمیل الصناعۃ یا بدائع الصنائع
از عطاء اللہ حسینی، براہین العجم فی قوانین العجم از لسان الملک میرزا محمد تقی سپہر کاشانی۔
اس مجموعے کا آخری مضمون 'شہر آشوب: ایک صنف سخن' ایک پر از معلومات

مبسوط اور جامع مقالہ کتاب کے ۲۷ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے' شہر آشوب کا ابتدائی مفہوم اور اس کی وجہ تسمیہ' شہر آشوب کا موضوع' شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں تنوع' شہر آشوب کا موجد' شہر آشوب کی ادبی حیثیت۔ ان کے بعد ایک ضمنی عنوان ہے "شہر آشوب کی غلط مثالیں"۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں شہر آشوب کی دو مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر ان کو اس صنف سخن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک بہت اہم عنوان ہو' اکبر بادشاہ اور شہر آشوب'۔ مسعود صاحب کے ذخیرۂ نوادر میں ایک مخطوط صفت الاصناف کے نام سے ہے' جس کے کسی دوسرے نسخے کا پتا نہیں ہے۔ اس کا مصنّف یوسف جرجانی دیباچۂ کتاب میں لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کا معائنہ کیا اور ہر صنعت گر کی صنعت کو دیکھ کر ایک شعر کہہ دیا۔ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مطلع کہا

دلبر چھیپی گر او در حسن بے ہمتا بود ۔۔۔ حرفہائے جاپۂ او سرنوشت ما بود

اور حکم دیا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حُسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ اِس حکم کی تعمیل کی گئی اور شعرا شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ یوسف پر سب سے زیادہ عنایت فرمائی اور اس نے یہ قطعہ حسب حال نظم کیا۔

خسرو عالم سخن رانی ۔۔۔ شاہ اکبر شہ فلک مقدار

شعرا را طلب نمود شبے ۔۔۔ کہ فشانند گوہر اشعار

ہمہ رفتند و پیش کش کردند ۔۔۔ از درِ نظم لولوے شہوار

بہ ہمہ لطفہا نمود ولے ۔۔۔ بہ ہمہ اندک و بہ من بسیار

گرچہ من خار بودم و ہمہ گل ۔۔۔ من شدم گل بہ پیش من ہمہ خار

یوسف نے شاہی حکم کی تعمیل میں سو رباعیاں کہہ کر ان کا مجموعہ صفت الاصناف کے نام سے مرتب کیا۔ شہر آشوب کی ابتدا اس رباعی سے کی۔

باشاہ وگدا نفع رساں چون ماہ است ‫‫ ‫‫ بے غش و دلخواہ است

از نام جہان پناہ اکبر شاہ است ‫‫ ‫‫ در عالم معنی شرفش بر زر مہر

اس مقالے میں فارسی کے گیارہ اور اردو کے ستائیس شہر آشوبوں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور آخر میں خاتمۂ کلام کے عنوان سے لکھا گیا ہو:-

"مسعود سعد سلمان سے شریر بن باسی تک تقریباً نو صدیاں گزریں۔ اس طولانی مدت میں فارسی اور اردو میں بہت سے شہر آشوب کہے گئے ہوں گے۔ ان میں سے جو راقم کے علم میں آئے ان کے نمونے ان کی بعض خصوصیتوں کے ذکر کے ساتھ اس مقالے میں تاریخی ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح شہر آشوب کے مفہوم میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کی ہیئت اور موضوع میں جو تنوع پیدا ہوتا رہا اس کا ایک خاکہ سامنے آگیا ہوگا اور یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔"

اندر سبھا

مصنفۂ

آغا حسن امانت لکھنوی

مرتبہ: پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

مسعود صاحب کی کتاب "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج امانت اور اندر سبھا" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

جنوری ۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو' میں جو اس وقت اورنگ آباد سے شائع ہوتا تھا محمد عمر و نور الٰہی صاحبان کا مقالہ 'ہندوستان کا ڈراما' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مقالہ بڑی کاوش و تحقیق سے لکھا گیا تھا۔ لیکن تحقیق کی بنیاد زیادہ تر قیاسوں اور افواہوں پر تھی۔ اس لیے جو نتیجے نکالے گئے وہ بیشتر حقیقت سے دور تھے۔ اس مقالے کو دیکھ کر مشہور ادیب مولوی عبدالحلیم شرر نے

اپنے ماہنامے 'دل گداز' میں ایک مضمون شائع کر کے صحیح حالات پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس مضمون کے جواب میں محمد عمر و نور الٰہی صاحبان نے لاہور کے رسالے 'ہزار داستان' میں ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں اپنے قیاسوں کی تائید میں کچھ اور قیاسی دلیلیں پیش کر کے اپنے خیال میں شرر کے ہر قول کو رد کر دیا۔ کچھ مدت بعد جب انھوں نے ڈرامے کی مبسوط تاریخ 'ناٹک ساگر' کے نام سے شائع کی تو اس میں دل گداز اور ہزار داستان والے دونوں مضمون شامل کر دیے گئے' اور اندر سبھا کے متعلق وہی سب باتیں دہرا دیں جو رسالہ اردو میں لکھ چکے تھے۔ غلط اطلاعوں پر یہ اعتماد اور بے بنیاد قیاسوں پر یہ اصرار دیکھ کر راقم نے ایک مقالہ 'اندر سبھا اور شرح اندر سبھا' کے عنوان سے اپریل ۱۹۲۶ء کے رسالۂ 'اردو' میں شائع کیا جس میں اندر سبھا کے متعلق کچھ نئی مستند معلومات پیش کیں۔ اس مقالے کے بارے میں مولانا احسن مارہروی لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

> "عام طور سے اندر سبھا امانت نظم میں مشہور ہے۔ سید مسعود صاحب رضوی نے اپنے ایک محققانہ مضمون کے ساتھ اس کی شرح نثر کو جو امانت لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے۔ اپریل ۱۹۲۶ء کے رسالہ 'اردو' اورنگ آباد دکن میں چھپوا کر اردو کے لیے بہترین تاریخی سرمایہ بہم پہنچایا ہے۔"
>
> (تاریخ نثر اردو مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۰ء)

اندر سبھا ابتدائی صورت میں ۱۲۶۸ھ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مصنف کی نظر ثانی کے مطابق دو مرتبہ ۱۲۷۲ھ اور ۱۲۷۵ھ میں شائع ہوئی۔ ان دونوں ایڈیشنوں میں امانت نے غزلوں اور گیتوں میں کمی بیشی کر دی اور بعض غزلوں میں سے کچھ شعر نکال ڈالے۔

۱۹۲۶ء میں نور الٰہی و محمد عمر نے اندر سبھا کو نئی صورت سے ترتیب دے کر مقدمے اور حاشیوں کے ساتھ لاہور سے شائع کیا۔ اس ترتیب میں غزلوں کے ایسے شعر اور گیتوں کے ایسے بول نکال ڈالے گئے جن میں فی الجملہ عریانی پائی جاتی تھی۔

اندر سبھا سیکڑوں مرتبہ چھپی لیکن اس کے چار اڈیشن غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، تین وہ انتہائی کمیاب اڈیشن جن میں خود مصنف نے ردو بدل، حذف و اضافہ کیا اور جن کی اشاعت کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا۔ چوتھا اڈیشن وہ جس کو فن ڈراما کے ماہر مولوی محمد عمر نے مرتب کرکے بڑے اہتمام سے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔

پروفیسر رضوی نے اندر سبھا کو ایک تحقیقی مقدمے اور کثیر ذیلی حاشیوں کے ساتھ اس طرح مرتب کرکے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا کہ اس میں یہ چاروں اڈیشن جمع ہو گئے ہیں اور ہر اڈیشن الگ الگ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس اڈیشن کے سرورق پر وہ قطعہ درج کر دیا گیا ہے جس میں امانت نے اس کے بالکل صحیح ہونے کی توثیق کرکے اپنی مہر لگا دی ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

صحیح اندر سبھا بس یہ چھپی ہے	گزر کر دیکھ میں اپنی نظر سے
برائے صحت اس پہ مہر کی ہے	غلط اس میں نہیں ہر ایک نقطہ

مہر میں 'امانت۔ ۱۲۵۹' درج ہے۔

اس اڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ "اندر سبھا کے متن کی ترتیب اس نوع کے بہترین کاموں میں شمار کی جائے گی"

(آج کل، دہلی، اردو نمبر اگست ۱۹۶۵ء)

امانت خوب جانتے تھے کہ اندر سبھا اس زمانے کے اخلاق و شرافت کے معیار پر پوری نہ اترے گی اور خواص اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ اس لیے وہ اس کی تصنیف کو اپنی طرف منسوب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لیے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا"

اردو ڈراما اور اسٹیج کی دوسری جلد اردو کا عوامی اسٹیج پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو

کے نامور ادیب ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کا مرکزی موضوع اندر سبھا کی تدوین ہے۔ مسعود صاحب نے امانت اور اندر سبھا کے متعلق ایسا تحقیقی مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے کہ شاید و باید۔ یہ مقدمہ مسعود صاحب ہی کے قلم سے ممکن تھا۔ مقدمہ کو پڑھتے وقت بار بار یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس موضوع پر تحقیق کے جو تقاضے تھے وہ سب پورے ہو گئے اور اب مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے بعد کوئی اور موضوع آجاتا ہے اور اس کے مطالب بھی اسی قدر معلومات افزا ہوتے ہیں۔ بار بار اسی طرح تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن فاضل مرتّب اپنے غیر معمولی علم سے قاری کی معلومات میں اور اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ غرض امانت اور اندر سبھا کے بارے میں جتنے پہلو ممکن ہو سکتے تھے ان سب پر بہت کچھ لکھ دیا ہے۔"

(دیکھئے علمی مجلس دلّی کا ماہی رسالہ "تحریر" مرتّبہ مالک رام کا شمارہ۔ اپریل تا جون ۱۹۷۲ء جو مسعود حسن رضوی ادیب سے مخصوص کر دیا گیا ہے)

"میرے مذکورہ بالا مقالے کی اشاعت کے ۱۶ برس بعد آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے ۱۹۴۳ء میں ۹ اپریل، ۲۱ اپریل، ۳ مئی، ۱۰ مئی اور ۲۰ جون کو میری ۵ تقریریں اودھ شاہی اسٹیج کے موضوع پر نشر کیں۔ اس اثنا میں اور اس کے بعد مدت تک اندر سبھا اور اس کے متعلقات کا مطالعہ اور اندر سبھا کے قدیم نسخوں کی تلاش جاری رہی۔ اس تلاش و تجسس کا نتیجہ اس کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔"

یہ کتاب تصنیف کر کے مسعود صاحب نے امانت کی اندر سبھا کو قعرِ ذلت سے نکال کر بامِ رفعت تک پہنچا دیا۔

اندر سبھا ابتدا میں اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ مسعود صاحب نے اپنی

کتاب "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" میں اندر سبھا کے متعلق معتبر ادیبوں کی رائیں بڑی تلاش سے جمع کر دی ہیں: تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں ناصر لکھنوی نے، ڈاکٹر مولوی نذیر احمد نے کتاب توبۃ النصوح میں، سید فخر الدین احمد نے تذکرہ مہر جہاں تاب میں، مولانا طباطبائی نے شرح دیوان غالب میں، حسرت موہانی نے اردوئے معلی مورخہ اگست ۱۹۰۳ء میں، امجد علی اشہری نے تقریظ دیوان فصاحت مشمولہ اردوئے معلی مورخہ ستمبر ۱۹۰۳ء میں، نور الٰہی محمد عمر نے اپنی مرتب کی ہوئی اندر سبھا کے تعارف میں اور اپنی کتاب ناٹک ساگر میں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستان شاعری میں اندر سبھا کے بارے میں اپنی رائے لکھی ہے۔

اشہری اس کو مرادی افسانہ بتاتے ہیں اور دیوؤں اور پریوں کو استعارات سمجھتے ہیں۔

حسرت اس کو مرادی افسانہ یا تمثیلی قصہ سمجھتے ہیں اور اس کی اس حیثیت کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کر کے اپنی رائے ان لفظوں سے ظاہر کرتے ہیں "اندر سبھا اہل مغرب کے بہت سے ڈراموں سے بہتر ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ شیکسپیر کے اوائل عمر کے بعض ڈراموں سے بھی بوجوہ احسن فائق ہے۔" (اردوئے معلی مورخہ اگست ۱۹۰۳ء)

شرر لکھنوی دیوان فصاحت کی تقریظ میں لکھتے ہیں "اندر سبھا ایسا اعلیٰ درجے کا ڈراما ہے جو اردو ادب کے عالم میں بالکل نئی اور حیرت انگیز ایجاد ہے۔ امانت مرحوم نے اندر سبھا سے اردو ڈراما کی بنا ڈال کے ہمارے لٹریچر پر ایسا احسان کیا ہے جو روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جائے گا اور جو نمایاں ہوگا اپنے موجد کے نام کو زیادہ چمکاتا رہے گا۔"

پرانی تہذیب کے پابند سنجیدہ اور ذی علم بزرگوں میں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی پہلے شخص ہیں جنھوں نے شرح دیوان غالب میں اندر سبھا کو اعلیٰ درجے کا کارنامہ قرار دے کر اس کو غزل گویوں کے کلام پر ترجیح دی ہے۔

بمبئی کے کچھ پارسیوں نے تھیٹر کی کمپنیاں قائم کر کے مشہور قصوں اور مثنویوں سے ڈرامے تیار کیے۔ اردو میں اندر سبھا سے زیادہ مقبول کوئی ناٹک نہ تھا۔ اس لیے ہر کمپنی

نے اس کو اپنے اپنے طور پر مرتب کروایا۔ اسی طرح اندر سبھا کی متعدد ترمیم شدہ صورتیں مختلف ناموں سے منظرِ عام پر آگئیں۔

بعض لوگ امانت کی اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈراما سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اندر سبھا کے وجود میں آنے سے پہلے واجد علی شاہ کے تین ڈرامے لکھے اور کھیلے جا چکے تھے۔ یہ ڈرامے ان کی تین مثنویوں پر مبنی تھے۔ جن کے نام یہ ہیں "دریائے تعشق"، "افسانۂ عشق"، "بحر الفت"۔ (دیکھئے ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر مورخہ ۱۹۵۹ء میں ادیب کا مضمون اردو ڈراما اور دربار اودھ)

اسلافِ میر انیس

اس کتاب میں میر انیس کے مورثِ اعلیٰ میر امامی سے میر خلیق تک انیس کی سات پشتوں کے تحقیقی حالات ہیں۔ کتاب تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام معنون کی گئی ہے۔ ابتدا میں ماخذوں کی طولانی فہرست ہے جو ۱۹ مخطوطات، ۱۵ مطبوعہ تذکروں اور ۱۹ دیگر مطبوعات پر مشتمل ہے۔ ماخذوں کی تعداد مصنف کی غیر معمولی کاوش کا ثبوت ہے۔

کتاب نظامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی اور ادارہ کتاب نگر لکھنؤ نے ۱۹۷۰ء میں شائع کی۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ گرد پوش اچھی صنعت کا نمونہ جاذبِ نظر ہے۔ ضمیمے میں کلیاتِ میر حسن کا معلومات افزا نادر الوجود دیباچہ ہے۔

شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب

نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۲ء پیش نامہ مرتب کے قلم سے

"غالب کے اردو دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں مولانا سید علی حیدر

نظم طباطبائی کی شرح کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولانا ایک مسلم الثبوت عالم، شاعر اور ناقد تھے۔ وہ دیوان غالب کی شرح میں کلامِ غالب کی تشریح و تفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔ ان کے مختصر لیکن نہایت اہم تنقیدی بیانات شرح کے تین سو صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں ہے۔ راقم نے ان کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان منتشر بیانات کو محاسن کلام اور معائب کلام کے دو بابوں میں مناسب عنوانوں کے تحت جمع کر دیا ہے۔"

محاسن کلام میں عنوانات کی تعداد بارہ اور معائب کلام میں پچیس[۲۵] ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب

امتیازات و عطّیات

۲۹ مارچ ۱۹۲۷ء ہندستانی اکاڈمی یوپی کے اولین تیس ممبروں میں تین سال کے لیے نامزد ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء تک تین تین سال کے لیے ممبر نامزد ہوتے رہے۔ سر ولیم میرس گورنر یونائیٹڈ پراونسز نے اکاڈمی کا افتتاح کیا۔ آنریبل رائے راجیشور بلی وزیر تعلیمات نے اپنی تقریر میں بتایا کہ گورنمنٹ اکاڈمی کے قیام کی ذمہ دار ہے۔ اس کی کارروائیوں کو اپنے اختیار میں رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ گورنمنٹ نے بڑی احتیاط سے اولین ممبروں کو نامزد کیا ہے جو سب کے سب لٹریچر کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے ہیں۔

مارچ ۱۹۴۴ء گورنمنٹ آف انڈیا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کے معائنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کا ایک ممبر میں
بھی مقرر ہوا۔ مارچ ۱۹۴۴ء کے تیسرے ہفتے میں میں اسی
غرض سے دہلی پہنچا اور پانچ دن جامعہ نگر میں قیام کیا۔"

(فائز دہلوی اور دیوانِ فائز پیش نامہ طبع اول صفحہ)

...... حکومت اترپردیش نے تین کتابوں پر ایک
ایک ہزار روپیہ انعام دیا، جن کے نام یہ ہیں، لکھنؤ کا شاہی
اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، رزم نامۂ انیس۔

۱۹۵۶ و ۱۹۵۹۔ .... ڈاکٹر ذاکر حسین نے مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ کے وزیٹر کی حیثیت سے دو مرتبہ تین
تین برس کے لیے یونیورسٹی کی اکزیکیٹو کاؤنسل کا ممبر نامزد کیا۔

۱۳ فروری ۱۹۶۰ء۔ حکومت ہند کی ادبی انجمن ساہتیہ اکاڈمی
کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے وگیان بھون، نئی دہلی
کی ایک خاص تقریب میں اردو ڈراما اور اسٹیج کی تصنیف
پر اکاڈمی کا सम्मान चिन्ह (نشان امتیاز) اور پانچ ہزار
روپے کی چیک عنایت کی۔

۱۹۶۳ء یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (U.G.C) نے تین سال
کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریسرچ پروفیسر مقرر
کیا۔ یکم اگست ۱۹۶۳ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۶۶ء تک۔

۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے فارسی کی
مسلّمہ قابلیت اور علمی شغف کے لیے، راشٹرپتی بھون نئی دہلی
کی ایک خاص تقریب میں سب سے بڑا علمی اعزاز، سرٹیفکیٹ

آف آنر (سند اعزاز) اور تین ہزار روپے کا سالانہ مستقل وظیفہ دیا۔ حکومت ہند کے ہوم سکریٹری اور ہوم منسٹر نے مبارک باد کے تار بھیجے۔

۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء۔ صدر جمہوریہ شری وی۔ وی گری نے ذاتی ادصاف کی بنا پر پدم شبھوشن کا اعزاز دیا۔ اترپردیش کے گورنر نے مبارک باد کا خط بھیجا۔

جنوری ۱۹۷۲ء۔ اترپردیش کے گورنر نے اردو اکاڈمی کاؤنسل اور مجلس انتظامیہ کا ممبر نامزد کیا۔

۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء۔ ادبی خدمات کے صلے میں پانچ ہزار روپے کا (विशिष्ट पुरस्कार) یعنی خاص الخاص انعام اور سند عطا کی۔

دسمبر ۱۹۷۲ء۔ اترپردیش اردو اکاڈمی نے اسلاف میرانیس نامی کتاب پر دو ہزار روپے کا خاص عطیہ دیا۔

۱۹۷۴ء۔ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، نئی دہلی کے ہر جہتی معائنے کے لیے سرکاری کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ دوسرے ممبروں کی معیت میں معائنہ کرنے کے بعد مذہبی تعلیم اور جامعہ کی لائبریری پر انفراداً تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

کتب ذیل ادیب کے نام معنون کی گئیں

تنقیدی شعور: سید اختر علی اختر تلہری۔ ۱۹۵۷ء

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات: ڈاکٹر محمد حسن۔ سنہ ۱۹۶۱ء

فسانۂ عجائب مرتبہ اطہر پرویز: سنہ ۱۹۶۹ء

اردو کی نثری داستانیں: ڈاکٹر گیان چند۔ اشاعت ثانی سنہ ۱۹۶۹ء

اردو کا پہلا پنجابی ڈرامہ: پروفیسر فصیح احمد صدیقی۔ سنہ ۱۹۶۲ء

مرثیہ بعد انیس: ڈاکٹر سید صفدر حسین، مطبع پنجاب آرٹ پریس لاہور سنہ ۱۹۷۱ء۔

مشاہدہ و مطالعہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی (زیر طبع)

تعبیر، تشریح، تنقید: ڈاکٹر مسیح الزماں سنہ ۱۹۵۵ء

ابتدائیہ/اختتامیہ

"مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات و خدمات" آپ کے سامنے ہے۔ اس کی افادیت اور معیار، حسن و قبح، اطناب اور تحدید کا فیصلہ بھی آپ کریں گے کہ یہی اصل فیصلہ ہوگا جو کتاب کی قدر و قیمت اور بقائے دوام کے بارے میں تاریخ ادب کا سفارشی بنے گا۔ مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ اس کتاب کا ابتدائیہ لکھنے کا فرض میرے لیے بیک وقت اطمینان بخش بھی ہے اور ملال انگیز بھی۔ زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اطمینان کا یہ جذبہ بھی نشاطیہ کے بجائے حزنیہ ہے۔ جشن شادی سے فارغ ہو کر سبکدوشی کا احساس بھی اطمینان ہوتا ہے اور ماتمی جلوس کے ساتھ میّت کو دفنانے کے بعد کا سکون بھی اطمینان ہی کہلاتا ہے۔ فرض دونوں صورتوں میں ادا ہوتا ہے لیکن اس کی نوعیت کتنی مختلف ہوتی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں بھی اختتامیہ کی (جسے عرف عام کے مطابق میں نے بھی ابتدائیہ کہہ دیا ہے) یہی آخری نوعیت ہے۔ کیسی خوشنما اور خوشگوار امید تھی، کتنا دلگداز نتیجہ نکلا۔ کتنا خوبصورت خواب تھا، کیسی بھیانک تعبیر نکلی۔ سوچا تو یہ تھا کہ یہ کتاب پروفیسر مسعود حسن رضوی کی زندگی میں سپاس و عقیدت کی ایک علامت کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی تو احباب، متوسلین، شاگرد و

اور مخلصوں کے علاوہ خود ممدوح اس سے کتنے خوش ہوں گے اور زندگی بھر کی خاموش محنت اور انتھک جدوجہد کے لیے عقیدت کے اس مظاہرہ کی بدولت ان کے دل کو کتنی تقویت اور ان کو کتنی روحانی مسرّت حاصل ہوگی؟ ہوا یہ کہ دکا دٹوں، خلل اندازیوں اور دشواریوں کے باعث یہ کتاب

چھٹی قفس سے تو بدلا ہوا زمانہ تھا

جسے اس برات کا دولھا بننا تھا وہ تعریف و تنقید سے ماوراء اُس جنّت کا باسی ہوگیا جس میں زوال اور ملال دونوں کی گنجائش نہیں۔ جس محفل کو جشن طرب بننا تھا وہ ایک طرح کے جلسۂ تعزیت میں ڈھل گئی۔ یہ کتاب جسے خراجِ عقیدت کے ایک گلدستے کے بہ طور صاحب ممدوح کی خدمت میں پیش ہونا تھا وہ داغ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کے استعارہ سے بھی آگے بڑھ کر "پروانے کی خاک" میں تبدیل ہوگئی کہ فی الواقع

یادگارِ رونقِ محفل ہے پروانے کی خاک

جتنا کچھ اب تک کہا گیا اسے اس جذباتی زلزلے کی ایک علامت اور اس ہلچل کا اظہار سمجھ کر نظر انداز کیجیے کہ اصل مقصد تو اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنا اور سببِ تصنیف کے متعلق معروضات پیش کرنا تھا۔ آج سے تین سال پہلے جب میرا اکاڈمی کی طرف سے سید مسعود حسن رضوی ادیب کی گراں مایہ تصنیف "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے ساتھ یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ اس کتاب کے باقاعدہ جشن اجراء کے موقع پر ایک ایسی کتاب بھی شایع کی جائے جو خود "سلطان عالم واجد علی شاہ" کے عظیم مصنّف کی حیات اور ان کی خاموش و عظیم خدمات کے تفصیلی تذکرے اور اعتراف پر مبنی ہو۔ انھوں نے جس خاموش لگن اور پُر وقار محنت و یکسوئی کے ساتھ اپنی پوری زندگی چمنستانِ ادب

کی آب یاری اور تزئین و تہذیب میں بسر کی وہ بجائے خود اتنی قابل تقلید اور ولولہ انگیز تھی کہ اس سے چشم پوشی اور غفلت بجائے خود ناسپاسی اور ناشکری کے مترادف ایک روّیہ اور میرے اپنے خیال میں ایک جرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے کمالِ تحقیق کا موزوں اعتراف یہی تھا کہ ان کی تصنیف "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" کے اجراء کی تقریب کو خود مصنّف کے جشنِ خدمات کی حیثیت دے کر ان کی حیات اور کارناموں کے موضوع پر لکھی ہوئی اس کتاب کو ہدیۂ عقیدت بنا کر ان کے حضور میں پیش کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ کسی ایسے شخص کو اس کام کی ذمہ داری سپرد کی جائے جو ان کے فنّی اور علمی کمالات کے علاوہ ان کی حیات اور ان کے شخصی عادات خصائل کے بارے میں بھی پوری آگاہی رکھتا ہو۔ کافی غور و فکر کے بعد بھی اس کام کے لیے مرزا جعفر حسین صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی دوسری نظر نہیں آئی جو اہلِ قلم، مصنف اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سیّد مسعود حسن رضوی کے رفیقِ دیرینہ اور اقرب قریب دوست کی مطلوبہ خصوصیت کے بھی مالک ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ مرزا جعفر حسین صاحب نے میری خواہش پر اس کتاب کو مرتب کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور بڑی کاوش اور تندہی کے ساتھ اس کتاب کی تالیف کے سنگلاخ مراحل طے کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ انھوں نے جتنی آگہی اور بصیرت کے ساتھ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کی زندگی کا اجمالی جائزہ لیا اور جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ ان کی تصنیفات کا جائزہ لے کر اس کتاب کو متنوع اور دلچسپ بنانے اور پوری طرح ان کی زندگی کے فریم پر محیط کرنے کی کوشش کی ہے وہ میری نظر میں نہ صرف اطمینان بخش ہے بلکہ قابلِ تعریف بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ مرزا جعفر حسین کی یہ تصنیف خود ان کے فنّی کمال کا ایک ثبوت اور سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کی زندگی کا

ایک ایسا آئینہ ثابت ہوگی جس میں ان کی شخصیت اور فن کی ہر تصویر روشن نظر آسکے گی۔

میں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ زیرِ تذکرہ کتاب صرف مرزا جعفر حسین کے ذاتی تاثرات کے اظہار تک محدود ہو کر رہ جائے بلکہ اردو کے متعدد اصحاب کمال رجال فن اور مستند ادیبوں سے بھی گزارش کی کہ وہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کی خدمات اور شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات مختصر طور پر لکھنے کی زحمت فرمائیں تاکہ یہ کتاب متنوع تاثرات اور رنگارنگ پہلوؤں کی حامل اور ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مسلّم سیرت نامہ بن سکے، اپنے عنوان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت پیدا کر سکے اور سید مسعود حسن رضوی کے کمال فن اور شخصیت کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے والے ایک مجموعہ کی صورت میں سامنے آسکے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری درخواست کو بیشتر حضرات نے شرف قبول بخشا اور اپنے تاثرات عنایت فرمائے۔ یہ تمام تاثرات اس کتاب کے ایک حصے کے طور پر شائع کیے جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے ذریعہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کی سیرت کو زیادہ سے زیادہ مکمل بنا کر پیش کرنے کا مقصد پورا ہوگا۔

غالباً یہ بات نامناسب نہ ہوگی اگر میں اپنے طور پر خود بھی اس کتاب کے مندرجات کی روشنی میں رضوی صاحب کی شخصیت کا ایک قلمی خاکہ پیش کر دوں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں:

"سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ادب کے راہبوں کی نسل کے آخری مصنف تھے"

تنویر علوی کے قول کے مطابق

"مسعود صاحب نے صرف کسی ایک نسل کو نہیں کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے"

ڈاکٹر گیان چند کی رائے میں

"ان کے تین ہیرو ہیں واجد علی شاہ۔ میر انیس اور محمد حسین آزاد"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول

"تحقیق کے شعبے میں انھوں نے 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' اور 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'

دو معرکۃ الآرا کتابیں شائع کیں۔"

(افسوس ہے کہ واجد علی شاہ اب ان کی بعد از حیات شائع ہو رہی ہے)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ

"انھوں نے مختلف حیثیتوں میں ایسا کام کیا جو فراموش نہیں کیا جا سکتا"

حیات اللہ انصاری کے فیصلے کے مطابق ان کی تصنیف

"ہماری شاعری کے بعد یہ بحث ہی ختم ہو گئی کہ ہماری شاعری مصنوعی ہے

اور اس شاعری پر حملہ اور اس کا دفاع ایک تاریخی کہانی بن گیا"

صالحہ عابد حسین کے خیال میں

"انیس اور اردو مرثیہ کو روشناس کرانے اور انھیں صحیح مقام دلانے میں مسعود

صاحب نے جو حصہ لیا وہ بے مثال ہے"

ڈاکٹر صفدر آہ کا انکشاف یہ ہے کہ

"ان کا تخلص ادیب صرف اسمی نہیں۔ وہ باذوق سخن فہم ہونے کے ساتھ

بڑے اچھے شاعر بھی ہیں"

ڈاکٹر وحید مرزا کے الفاظ میں

"دو شخصیتیں ان کی توجہ اور مطالعہ کا خاص مرکز رہیں ایک انیس اور دوسرے

واجد علی شاہ"

مولانا امتیاز علی عرشی فرماتے ہیں کہ

"انھوں نے اردو شاعری کا 'ہماری شاعری' لکھ کر دفاع کیا اور تحقیقی و تنقیدی

ادب میں اضافہ کیا"

مالک رام کی نظر میں انھوں نے

"واجد علی شاہ پر انگریزوں کے حملہ کا دفاع کیا اور اس عہد کی ڈرامہ نگاری اور اسٹیج پر جو کام کیا اس پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق

"صحت کے علاوہ فصاحت اور لطافت ان کا حصّہ ہے"

اور ڈاکٹر عابد حسین کے نزدیک

"وہ ہماری سچّی مشرقی تہذیب کے آخری نمونوں میں سے تھے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی خدمت، تحقیق اور ترجمانی کا کوئی تذکرہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ وہ دیوزادوں کی اس نسل کے آخری فرد تھے جو بے ستون سے جوئے شیر لانے کا حوصلہ اور قوت رکھتی تھی۔ انھوں نے زندگی بھر اردو کے لیے کام کیا اور اردو کو اپنا اوڑھنا، بچھونا بنائے رکھا اور اردو کی خدمت کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایسی با حوصلہ اور عدیم النظیر صلاحیتوں کی حامل شخصیتیں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ آج وہ ہمارے درمیان شخصی طور پر موجود نہیں لیکن معنوی حیثیت سے اپنے شہ پاروں اور شاہکاروں کی صورت میں نہ صرف ہمارے بلکہ آنے والی ان تمام نسلوں کے درمیان موجود رہیں گے جو اردو زبان کی ترقی کے لیے خدمت اور تحقیق کے جذبہ سے کام کرنے کی خواہشمند ہوں گی ——— میری دعا ہے کہ زیر نظر تالیف قبول عام کا شرف حاصل کرے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سید مسعود حسن رضوی ادیب کی شخصیت اور کارناموں سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں، ادیبوں اور محققوں کے لیے مشعل راہ کا کام انجام دیتی رہے۔

لکھنؤ

۱۹ دسمبر ۱۹۸۶ء

مقبول احمد لاری
(صدر آل انڈیا میر اکاڈمی)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مسعود حسن رضوی صاحب ان گنے چنے لکھنے والوں میں سے ہیں جو صحیح اردو لکھتے ہیں، اور میں ان کی قدر دل سے کرتا ہوں۔ اور صحت کے علاوہ فصاحت اور لطافت ان کا حصّہ ہے۔

ادبی مسائل کی تحقیق میں بھی ان کا قلم کسی سے پیچھے نہیں بلکہ بہتوں سے آگے ہے۔ ان بچارہ کی صحت بڑی خراب رہنے لگی ہے اور یہ بات ہم سب کے صدمہ و غم کی ہے۔ میں خود ہی ایسا مریض ہوں کہ زیادہ لکھنے سے معذور ہوں۔

عبدالماجد

مولانا امتیاز علی عرشی

مسعود صاحب اردو کے اُن چند بزرگ ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کے دم سے ادبی تحقیق کی آبرو قائم ہے انھوں نے اپنی تمام زندگی علم و ادب کی ترویج و ترقی ہی میں نہیں بلکہ اس کے تحفظ میں بسر کی ہے۔ یعنی ایک طرف وہ اپنے قلم سے ہمارے تنقیدی و تحقیقی ادب میں اضافے کرتے رہے تو دوسری طرف لکھنؤ کے نخاس میں گرد آلود اور کرم زدہ کتابوں سے علمی و ادبی جواہر تلاش کرکے اپنے کتب خانے کو سجاتے رہے۔ اور اس طرح گزشتہ نسلوں کے سیکڑوں کارنامے آیندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نیک کام کرنے والے کی زندگی کیسی مبارک ہوگی اور کس درجہ لائق تقلید۔

مسعود صاحب نے اپنے صاف ستھرے مزاج کی بنا پر جو کام انجام دیے ہیں ان کی قدر و منزلت ہمیشہ کی جاتی رہے گی۔ اس میں بعض جرأت مندانہ اقدام بھی ہیں۔ مولانا حالی نے غزل کی شاعری کو بے وقت کی راگنی قرار دیا تھا؛ تو وہ بر بنائے خلوص تھا۔ لیکن مسعود صاحب نے جب "ہماری شاعری" لکھ کر غزل

کا دفاع کیا تو وہ بھی وقت کی ضرورت تھی۔ ان کی یہ کتاب خود مقدمہ شعر و شاعری کی طرح کلاسیکی ادب کا جز بن چکی ہے اسی طرح واجد علی شاہ اور مرثیہ اور اس رشتے سے انیس پر بھی جیسا اور جتنا دقیق کام مسعود صاحب کا ہے وہ ناقابل فراموش رہے گا۔

مسعود صاحب سے مجھے برسوں سے نیاز حاصل ہے وہ مجھ پر ہمیشہ ایک بزرگ دوست کی طرح مہربان رہے۔ اور بعض اوقات میری خاطر ایثار سے بھی کام لیا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے غالب کے متعدد نادر فارسی خطوط مجھے اس وقت عطا کر دیے تھے جب خود وہ انھیں شائع کرنے کا عزم و ارادہ رکھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آیندہ ان کی اشاعت کا اہتمام بھی میں نے ہی کیا اور وہ مجموعہ متفرقات غالب کے عنوان سے کتب خانہ رام پور کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل ہوا۔

مجھے دلی مسرت ہے کہ ان کے جشن کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، خدا کرے یہ جشن اس طرح منایا جائے کہ وہ حالیہ علالت سے صحت یاب ہو چکے ہوں اور بہ نفسِ نفیس جلسہ گاہ میں تشریف فرما ہو کر دیکھ رہے ہوں کہ کس طرح ان کی خدمات کے اعتراف میں اہل علم کے دل ان کے ممنون احسان ہی نہیں ان کی محبت سے لبریز بھی ہیں۔

ڈاکٹر وحید مرزا

جب میں جنوری ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم ہوا تو شروع سے ہی عربی و فارسی کے بعض اساتذہ سے بہت خوش گوار تعلقات قائم ہوگئے۔ ان میں ایک خلیل بن محمد عرب صاحب تھے جو میرے ساتھ عربی پڑھاتے تھے، ایک مولوی مصطفےٰ حسن صاحب علوی جو یونیورسٹی کے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں معلم تھے، ایک مولوی عبدالقوی ثانی صاحب جو فارسی کے استاد تھے اور ایک سید مسعود حسن رضوی صاحب جو ان دنوں اردو پڑھاتے تھے، یہ سب حضرات مجھ سے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے اور دل چسپ خصوصیات کے حامل تھے۔ مسعود حسن رضوی صاحب اپنی خوش پوشی اور جامہ زیبی کے لیے مشہور تھے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی یہ خصوصیت ہمیشہ قائم رکھی۔ وہ اس زمانے میں شیروانی اور چوڑی دار یا تنگ موہری کا پائجامہ پہنتے تھے۔ ان کے کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے اور استری شدہ ہوتے تھے، مجال نہ تھی کہ کہیں کوئی شکن یا بل نظر آئے۔ ان کے جوتے بھی بہت اچھے اور پالش کیے ہوئے ہوتے تھے، بلکہ

مجھے یاد ہے کہ وہ یونیورسٹی آنے کے بعد انھیں بہت احتیاط سے کسی رومال یا جھاڑن سے صاف کر لیتے تھے۔ بعد ازاں وہ کوٹ اور پتلون بھی پہننے لگے تھے لیکن اس لباس میں بھی ان کا وہ قدیم اہتمام باقی رہا، پتلون کی کریز کبھی خراب نہ ہوتی تھی۔ کالر ہمیشہ صاف ستھرا اور ٹائی کی گرہ ہمیشہ قاعدے کی ہوتی تھی۔ ان کی گفتگو اکثر و بیشتر کسی علمی یا ادبی موضوع پر ہوتی تھی۔ طبیعت میں طنز و مزاح کا مادّہ موجود ضرور تھا لیکن بیکار باتوں اور یادہ گوئی سے اجتناب کرتے تھے۔ اردو ادب سے انھیں بالخصوص انتہائی شغف تھا اور اگرچہ وہ بعد ازاں فارسی کے ریڈر (ریٹائر ہونے سے کچھ عرصہ پہلے پروفیسر) ہو گئے تھے اردو ادب سے ان کی دلچسپی بدستور باقی رہی، چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے اردو شاعری کے دفاع میں، جسے مہمل اور بیکار قرار دینے کا رجحان بڑھتا جا رہا تھا (خصوصاً مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی بدولت) ایک نہایت مدلل اور پر مغز کتاب "ہماری شاعری" کے نام سے تصنیف کی جس میں اردو شاعری کی گوناگوں خوبیوں اور افادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے مسعود حسن صاحب کو سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کسی چیز کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ اگر تھا تو اسی سلسلے میں نادر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے جمع کرنے کا۔ اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے انھیں موقع بھی بہت اچھا

مل گیا تھا، کیونکہ وہ پہلے فرنگی محل کے پل کے قریب ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے جہاں سے وہ بآسانی ہر اتوار کو نخاس کے بازار میں پرانی کتابوں کے بیچنے والوں کی دکانو کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور جو کتاب کارآمد نظر آتی وہ خرید لیتے تھے۔ چنانچہ اس طرح انھوں نے ایک خاصی بڑی لائبریری جمع کرلی تھی۔ اس کے بعد جب انھوں نے حامد حسن انجینئر صاحب کا مکان واقع دین دیال روڈ خرید لیا تو وہ بھی نخاس سے چنداں دور نہ تھا اور اس طرح ان کا کتابیں جمع کرنے کا شوق پورا ہوتا رہا۔ وہ خود اگرچہ لکھنؤ کے نہیں تھے بیوتنی کے باشندے تھے لیکن لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے انھیں والہانہ انس اور لگاؤ تھا، اور لکھنؤ والوں میں دو شخصیتیں ان کی توجہ اور مطالعے کا خاص مرکز رہیں، یعنی ایک تو میرانیس جن کے بارے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے دس چیدہ چیدہ مرثیے منتخب کرکے شائع کیے اور دوسرے واجد علی شاہ آخری تاجدار لکھنؤ جن کے مصدقہ اور مستند حالات زندگی مرتب کرنے میں انھوں نے کئی سال تک انتھک محنت کی اور ان کے بارے میں غلط بیانیوں اور بہتان تراشیوں کا ازالہ کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کردی۔ مسعود حسن صاحب کے نزدیک واجد علی شاہ محض رنگیلے نہ تھے اور ان کا بڑا شغل یہ نہیں تھا کہ اندر سبھا کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ شہ سواری میں ماہر اور سیر و شکار کے شوقین بھی تھے۔ فارسی میں ان

کی استعداد بہت اچھی تھی اور سرکاری کاغذات پر بلا تامّل فارسی
میں احکام اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ مسعود حسن صاحب یہ ثابت
کرنا چاہتے تھے کہ اودھ کے اس بادشاہ کی جو تصویر یورپی مورخین
نے، اور ان کی تقلید میں خود ہمارے لکھنے والوں نے پیش
کی ہے وہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ
ان کی برسوں کی لگاتار محنت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور
واجد علی شاہ پر ان کی کتاب شائع ہو رہی ہے۔

جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا تعلق ہے مسعود
حسن صاحب سانولے رنگ کے تھے اور شروع میں دبلے تھے،
بعد میں ان کا جسم کچھ بھر گیا تھا اور شکل زیادہ بارعب ہو گئی
تھی۔ شروع زمانے میں چھوٹی سی داڑھی بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ
میرے پاس ۱۹۳۰ء کا ایک گروپ فوٹو گراف ہے جو ڈاکٹر
بذل الرحمان صاحب کے لکھنؤ یونیورسٹی کو چھوڑتے وقت لیا گیا
تھا۔ اس میں ان کی داڑھی ہے۔ بعد میں انھوں نے داڑھی
مونڈوا دی تھی۔ بالوں میں مانگ ہمیشہ بیچ کی یعنی سیدھی نکالتے
تھے اور ایک ذرا اونچی باڑھ کی سیاہ ٹوپی استعمال کرتے
تھے۔ وضعداری اور انفرادیت پسندی ان کا طرّۂ امتیاز تھا۔
یونیورسٹی آنے جانے کے لیے انھوں نے ایک تانگہ اور گھوڑا لے
لیا تھا۔ اسی میں آخر تک آتے رہے، حالانکہ اگر چاہتے تو
موٹر خرید سکتے تھے۔ جب دین دیال روڈ کا مکان خریدا تو
اس میں بڑے سلیقے سے اپنے حسبِ منشا بعض تبدیلیاں اور

اضافے کیے اور نام بھی اس کا ادبستان رکھا جو بہ ظاہر کسی مکان کے لیے چنداں موزوں نہ تھا لیکن اس نام کے انتخاب میں بھی ان کی جدت پسندی کار فرما تھی۔ پابندی اوقات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یاد نہیں کہ وہ کبھی یونیورسٹی دیر میں پہنچے ہوں۔ چھٹی بہت کم لیتے تھے اور اگر کبھی لیتے تھے تو کسی خاص ضرورت سے۔ اپنی ذاتی مثال اور تربیت و ہمت افزائی سے انھوں نے اپنے شاگردوں میں بھی علمی جستجو کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے تین نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اعلیٰ تعلیمی عہدوں پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر صفدر آہ ("میرے مسعود حسن ادیب")

مجھے یاد ہے کہ مسعود حسن صاحب ادیب سے میرے روابط ۱۹۲۴ء میں شروع ہوئے اور آج ۱۹۷۵ء میں ہماری دوستی کی عمر اکاون سال کی ہوچکی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وقت کے باقیات الصالحات میں شاید میں ہی ان کا سب سے پرانا نیازمند ہوں۔

مجھے کتنی مسرت ہے کہ آج ادیب صاحب کی سوانح عمری کا اجرا ہورہا ہے۔ یہ کتاب لکھنے کا حق دراصل مجھے تھا۔ لیکن میں خوش ہوں کہ اسے ایک اہل صاحب قلم مرزا جعفر حسین نے تحریر کیا ہے جو ادیب صاحب کو ذاتی طور پر بھی بہت قریب سے جانتے ہیں۔

دوسری کتاب جس کا اجرا آج عمل میں آرہا ہے وہ خود ادیب صاحب کی مایۂ ناز تصنیف واجد علی شاہ ہے۔ لکھنؤ اور واجد علی شاہ ادیب صاحب کے محبوب ترین موضوع ہیں ان موضوعات اور ان کے ضمنیات پر ادیب صاحب کے قلم نے جو بے عدیل تحقیقی کارنامے انجام دئے ہیں وہ علم کی دنیا میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔ واجد علی شاہ اس سلسلۂ تصنیف کا نقطۂ

آخر ہے اور مجھے امید ہے کہ حرفِ آخر ہی کی طرح یہ
ایک دائم اور قائم کتاب ہوگی۔

ادیب صاحب کی عالمانہ شخصیت، تحقیقی صلاحیت اور
ادبی قابلیت پر میں چند بار کسی قدر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔
اس وقت میں ان کے متعلق صرف اپنے نجی تاثرات چند سطروں
میں تحریر کروں گا۔

ادیب صاحب سے مل کر سب سے پہلے جو چیز سامنے
آتی ہے وہ ان کی شائستگی اور نستعلیق مزاجی ہے۔ اپنی گفتگو
سے لے کر تحریروں تک وہ شائستگی کا ایک مثالی نمونہ نظر
آتے ہیں۔ اس شائستگی کا اثر ان پر اتنا گہرا ہے کہ ان کی
نفسیاتی تدوین پوری طرح اس وصف کی تابع ہے۔ اس کی ایک
معمولی مثال یہ ہے کہ جب کبھی میں ان کے یہاں مہمان
ہوتا ہوں تو میرا پلنگ ان کے پلنگ کے برابر ہوتا ہے۔ رات
کو ہم دیر تک باتیں کرتے ہیں اور اس کے بعد سو جاتے ہیں۔
شب خوابی کی ٹوپی وہ بھی پہنتے ہیں اور میں بھی پہنتا ہوں۔
سویرے میری ٹوپی تو سر سے اتر کر پائینتی ملتی ہے۔ لیکن ان
کی ٹوپی اسی طرح جمی رہتی ہے جس طرح وہ پہن کر سوتے ہیں۔
ایک دن میں نے تعجب سے پوچھا کہ نیند میں آپ کی
ٹوپی سر سے ذرا بھی نہیں کھسکتی ہے۔ جواب میں ہنس کر کہنے
لگے کہ مجال ہے کھسک جائے۔ گویا شائستگی خواب میں بھی
ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

ان کا حافظہ حیرت ناک ہے۔ کتابوں کے علاوہ معمولی باتیں جو انھوں نے چالیس سال پہلے بیان کی تھیں اگر آج پھر بیان کریں گے تو الفاظ، سکون و حرکت اور لب لہجہ بھی وہی ہوگا جو چالیس سال پہلے آپ سن چکے ہیں۔

ایک دن میں آیا تو ادیب صاحب کی آواز اس طرح آرہی تھی جیسے وہ بالجہر کسی کو اپنا مضمون سنا رہے ہوں۔ اندر جاکر دیکھا تو ہال میں ایک کرسی پر ادیب صاحب ایک کتاب لیے بیٹھے ہیں اور اُسے زور زور سے پڑھ رہے ہیں۔ سامنے سارا ہال خالی پڑا ہے۔ عجیب منظر تھا۔ وہ مطالعے میں منہمک تھے اور میں متحیر پیچھے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں ادیب صاحب نے کتاب بند کی، پھر مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ اس طرح ہر عبارت کا مفہوم ذہن میں نقش ہوجاتا ہے یہ حقیقت ہے کہ ان کا حافظہ ایک جیتی جاگتی لائبریری ہے۔

ادیب صاحب کو آم پسند ہیں۔ لیکن وہ میری طرح آموں کے عاشق نہیں ہیں۔ اس کے باوجود جس زمانے میں میں سیتاپور میں تھا تو آموں کی فصل میں انھیں سیتاپور کھینچ لایا۔ یہاں ان کی آمد کا اعلان سیتاپور اور نواح سیتاپور میں پہلے ہی کردا دیا گیا تھا۔ معیّنہ تاریخ پر ٹاؤن ہال کے بڑے سے ہال میں ان کے ریسپشن کا جلسہ ہوا۔ اس روز عوام میں ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔

جلسے کے وقت سے بہت پہلے پورا ہال بھر گیا تھا اور لوگ باہر لان تک بیٹھے ہوئے تھے۔ ادیب صاحب نے اپنے دو ایک مضمون جلسے میں پڑھے جن کا تاثر یادگار رہا۔

ان کا تخلص ادیب صرف رسماً نہیں۔ وہ باذوق سخن فہم ہونے کے ساتھ بڑے اچھے شاعر بھی ہیں۔ شعر کے معنی کی گہرائیاں بیان کرنے میں وہ اپنے عہد میں بے مثال ہیں۔ شعر گوئی کا شغل دوزنی علمی کاموں کی وجہ سے اب شاید ترک ہوگیا ہے۔ لیکن انکے جو شعر ہیں وہ بے حد پختہ اور بامزہ ہیں۔ دو ایک شعر شاکر ہیں رخصت ہوتا ہوں ۔

پختہ کارانِ جنوں کو ہوشِ ننگ و نام کیا　　خوفِ رسوائی نہیں تو ضبطِ غم سے کام کیا
دل میں جو رہتا ہے اس کو نامہ و پیغام کیا　　خط سے کیا مطلب تجھے قاصد سے تجھ کو کام کیا

دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آزاد ہوں میں　　پاؤں میں ہوتی ہے بیڑی کی گرانی محسوس

دل کی دنیا کے بہت سے راز اب ہم پر کھلے　　اس کی چشمِ مست سے ہشیاریوں کے در کھلے

ڈاکٹر سید عابد حسین

اب سے پچاس برس پہلے ۱۹۲۶ء میں، جب میں یورپ میں اپنی تعلیم مکمل کرکے ہندوستان واپس آیا اور جامعہ ملّیہ میں پروفیسر مقرر ہوا اس وقت جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کی کتاب 'ہماری شاعری' کی اردو دنیا میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کتاب کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ذہنی آزادی کی اُس تحریک کا ایک اہم حصّہ تھی جو ہمارے ملک میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے شروع ہوچکی تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اسی تحریک کے عظیم قائد تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ ہندوستانی زبانوں کا علمی اور ادبی سرمایہ مغربی علم و ادب کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے مسعود حسن رضوی صاحب نے اپنی اس کتاب میں مدلّل بحث کی تھی کہ جو لوگ اردو شاعری کو تقویم پارینہ سمجھتے ہیں انھوں نے اس کا مطالعہ محض سرسری نظر سے، اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ مغربی نظر سے کیا ہے۔

اس کے بعد جب مجھے مسعود حسن صاحب کی زیارت کا شرف نصیب ہوا، اور بار بار ہوتا رہا تو ان کے ذہنی کمالات کے

ساتھ ساتھ ان کے حُسنِ اخلاق، لطف و کرم اور دوسری اعلیٰ انسانی صفات کا سکّہ میرے دل پر روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ وہ ہماری سچّی مشرقی تہذیب کے آخری نمونوں میں سے ہیں اور خدا سے یہ دعا ہے کہ ان کا سایہ ہمارے سر پر قائم رہے۔

مالک رام (پروفیسر مسعود حسن رضوی کی اوّلیات)

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو زبان کے ان محسنوں اور خدمت گزاروں میں سے ہیں، جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ گنتی کے ان لوگوں میں سے ہیں، جو کام فرض سمجھ کے کرتے ہیں، نہ کہ کسی صلے یا ستائش کی توقع پر۔ انھوں نے نصف صدی سے زائد کے زمانے میں زبان کو کمیت اور کیفیت، دونوں پہلوؤں سے اتنا کچھ دیا ہے کہ اردو زبان کا کوئی مورّخ ان کے بارِ احسان سے سر نہیں اٹھا سکتا۔

پروفیسر ادیب کو بعض امور میں اوّلیت حاصل ہے۔ انھوں نے جن میدانوں میں کام کیا ہے، ان پر ان سے پہلے الّا ماشاءاللہ کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ اگرچہ انھوں نے اپنی تقریباً تین درجن کتابوں اور بیسیوں مقالوں میں گونا گوں موضوعات سے اعتنا کیا ہے، لیکن بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے دو خاص موضوع رہے ہیں: اول، مرثیہ کی تاریخ عموماً اور انیسیات خصوصاً، دوسرے لکھنؤ کے شاہی زمانے کے آخری دور کی تاریخ اور اس میں بھی خاص

واجد علی شاہ کا عہد۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور تجزیہ کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ جب بھی کوئی شخص، سنجیدگی سے، ان میں سے کسی ایک موضوع کا مطالعہ کرتا، لابدُ تھا کہ وہ دوسرے تک پہنچ جاتا۔ لیکن الفضل للمتقدّم۔

شاہی سرپرستی اور عوامی رجحانات کے زیرِ اثر مرثیہ انیس اور دبیر سے قبل ہی بہت مقبول ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا مقصد ادبی سے کہیں زیادہ مذہبی تھا، اور تنقید تو برائے نام بھی نہیں تھی۔ پہلی مرتبہ اس پر شبلی نے قلم اٹھایا۔ اور چونکہ انھوں نے انیس کو دبیر پر ترجیح دی تھی اس لیے "دبیریوں" نے ان کے جواب میں کتابوں کا تانتا لگا دیا، الموازنہ، ردالموازنہ، المیزان ــــ غرض چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت محدود مقصد تھا، یعنی محض شبلی کے نظریات اور اعتراضات کی تردید۔ اس سے نہ فی نفسہٖ مرثیہ کی کوئی خدمت ہوئی، نہ کسی تعمیری مقصد ہی کی تکمیل۔ اس کام کی بسم اللہ مسعود صاحب نے کی۔ انھوں نے اردو مرثیہ کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے جو اساسی کام کیا ہے، ہنوز اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ کہاں کہاں سے انھوں نے مرثیے جمع کیے! کون کون سے مرثیہ گویوں کے حالات مہیّا کیے! بیسیوں مقالے لکھے، جن میں ان مرثیہ نگاروں اور ان کی

نگارشات کو پہلی مرتبہ ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ پھر انیس کے منتخب مراثی کو بہ طریقِ احسن پیش کرکے انھوں نے عام قاری کے ذوق کی تربیت کی۔ بارے، ان کی کوششیں بارور ہوئیں اور مرثیہ مذہب کے محدود دائرے سے نکل کر ادبی موضوع بن گیا اور معلم اور متعلم، ہر دو اس سے یکساں دلچسپی لینے لگے، اور محظوظ ہونے لگے۔

اگر آج ہم اپنی ادبی تاریخ میں مرثیہ کی صنف کو نمایاں مقام دیتے ہیں، تو یہ امر واقع ہے کہ اس میں بہت حد تک مسعود صاحب کی مساعی کا دخل ہے، ورنہ لوگ یہی خیال کرتے کہ گویا انیس اور دبیر یا ان کے چند پیشروؤں سے پہلے اردو میں مرثیہ تھا ہی نہیں۔ جب کوئی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو بعد کے آنے والوں کو اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اولین کارکنوں نے کس طرح اسے اپنے خونِ جگر سے اسکی آبیاری کی تھی۔

مسعود صاحب کے کام کا دوسرا میدان، جیسا کہ میں نے عرض کیا، واجد علی شاہ کا دورِ حکومت رہا ہے۔ اودھ کا الحاق فروری ۱۸۵۶ء میں اسی کے عہد میں ہوا تھا۔ اس پر پورے ملک میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ واجد علی شاہ یقیناً فرشتہ تو نہیں تھا، اس میں بھی کمزوریاں تھیں، اور کس میں نہیں ہوتیں۔ کیا خود انگریزی حکومت کے وہ نمائندے جنھوں نے اودھ اور واجد علی شاہ کی قسمت کا فیصلہ کیا تھا،

مبرا عن الخطا تھے! لیکن جس کی لاٹھی، اس کی بھینس۔ چونکہ ان کے پاس طاقت تھی، انگریز من مانی کر گزرے۔

انگریزوں نے اس کھلی ناانصافی اور سینہ زوری کو درست ثابت کرنے کے جو جتن کیے، اس پر اس زمانے کی تاریخیں شاہد ہیں۔ رُبع صدی پہلے میکالے نے انگریزی اقتدار کے جواز میں اس کی منزلِ مقصود کی سمت تو متعیّن کر ہی دی تھی، اب اودھ سے متعلق انگریزوں کی نئی حکمتِ عملی کے دفاع میں مورخوں نے اس کی تقلید کی۔ انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیا کہ واجد علی شاہ عیاش اور نالائق تھا، اس کی حکومت "اودھ کی بیچاری رعایا کو ضائع اور برباد" کر رہی تھی۔ انگریزوں نے اگر اودھ کا الحاق کیا، تو اس سے مقصود صرف لوگوں کو اس "متمرّد، لاابالی اور سہل انگار" حکومت سے محفوظ کرنا اور انھیں ایک مہذب اور روشن خیال طرزِ حکومت کی برکتوں سے مالا مال کرنا تھا۔

پراپیگنڈے میں جو طاقت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جب غلط سے غلط اور ناممکن بات بھی دن رات آپ کے کان میں پڑتی رہے، تو ممکن ہے کہ آپ شروع میں اس پر اعتبار نہ کریں، لیکن ناممکن ہے کہ کچھ دن بعد آپ اس کے کسی نہ کسی حصّے کو تسلیم نہ کرنے لگیں۔ پراپیگنڈا کرنے والا بھی انسانی فطرت کی اس بنیادی کمزوری سے خوب واقف ہے، اسی لیے اسے اپنی کامیابی کا (یہ لاکھ جُزوی ہی سہی) یقین

ہوتا ہے، اور وہ اپنی سراسر گمراہ کن سرگرمیوں میں استقلال سے لگا رہتا ہے۔ انگریزوں نے بھی یہی کیا، اور واجد علی شاہ کو کشتنی اور گردن زدنی ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور بالآخر وہ اسے مکروہ رنگ میں دکھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بعد کو ہندستانی مورخ بھی اپنی سادگی اور ناواقفیت سے ان کی تقلید کرنے لگے۔

مسعود صاحب نے اس افسوسناک صورتِ حال کی اصلاح کے لیے واجد علی شاہی دور کا روشن پہلو نمایاں کرنے پر کمرِ ہمّت چست باندھ لی۔ انھوں نے اس عہد کی علمی اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو منظرِ عام پر لانے کی غرض سے متعدد مضمون شائع کیے اور ثابت کیا کہ علوم و فنون اور شعر و ادب کی جتنی سرپرستی، اور اس کے نتیجے میں جتنی ترقی اس حکومت کے زمانے میں ہوئی، وہ کسی دوسرے دور سے کم نہیں تھی۔ بس، یہ خیال کرنا کہ یہ ہماری تاریخ کا تاریک دور تھا، سراسر غلط فہمی پر مبنی اور ناانصافی ہے۔

اگر آج ہم پرانے پراپگنڈے کے باوجود، واجد علی شاہ کے بارے میں کچھ ٹھنڈے دل سے سننے اور سوچنے پر آمادہ ہیں، تو اس کامیابی کا سہرا بھی بجا طور پر مسعود صاحب کے سر ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس عہد کی ڈراما نگاری اور اسٹیج پر انھوں نے جو کام کیا

(جس پر انھیں ساہتیہ اکاڈیمی کا انعام ملا) اور امانت کی اندر سبھا کے اصلی متن کی بازیافت بھی اسی مطالعے کا ضمنی نتیجہ تھی۔

کیا ہم ایسی تاریخ ساز شخصیت کو بھلا سکتے ہیں یا کبھی اس کے احسان کا بدلہ چکا سکتے ہیں؟

حیات اللہ انصاری

اردو ادب کی لائبریری میں آپ کو پروفیسر مسعود حسن رضوی کی کتاب 'ہماری شاعری' ضرور نظر آئے گی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں کیجئے کہ جب برطانی سامراج نے ہندستانیوں کی آزادی چھین لی تو اس قوم کو ناکارہ بنانے اور اس میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لیے اس کی صنعت و حرفت اور آرٹ اور کلچر پر بھی حملہ کر دیا۔ جو چیزیں زد میں آئیں ان میں اردو شاعری بھی تھی۔ اس کو برطانی عیاروں نے گل و بلبل کی لاحاصل داستان اور مصنوعی جذبات نگاری قرار دے کر مسترد کرا دیا تھا۔ جس طرح گاندھی جی، مولانا آزاد اور جواہر لال جی نے برطانی سامراج کا سیاسی اور اقتصادی میدانوں میں مقابلہ کیا، اسی طرح اردو دوستوں کا ایک گروہ اردو شاعری کا دفاع کرنے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن یہ دفاع مقالوں اور کتابچوں سے آگے نہ جا سکا۔ جس شخص نے اس حملے کا باضابطہ اور پرشکوہ مقابلہ کیا، وہ ہے مسعود حسن رضوی۔ اس نے اعتراضوں میں غوطہ مار کر ثابت کیا کہ ان کی تہہ میں کیچڑ ہی کیچڑ ہے اور پھر دکھایا کہ اردو شاعری کا خزانہ کیسے کیسے جواہرات سے مالا مال ہے۔

مسعود حسن رضوی کی اس کتاب کے بعد یہ بحث

ہی ختم ہوگئی کہ ہماری شاعری مصنوعی ہے اور اس شاعری پر حملہ اور اس کا دفاع ایک تاریخی کہانی بن گیا۔ لیکن یہ کہانی ایسی ہے کہ تاریخ ادب اردو کا کوئی بھی طالب علم کسی بھی دور میں اس کہانی کے مطالعے کے بغیر اردو ادب کے ارتقا کا واقف کار نہ بن سکے گا۔ یعنی مسعود حسن رضوی نے اردو ادب کے ایک گوشے میں جو راج قائم کرلیا ہے وہ لافانی ہے۔

یہ تو تھی ابتدا مسعود حسن رضوی کے ادبی کارناموں کی۔ اس کے بعد انھوں نے بہت کچھ کیا۔ انیس کو مرثیہ نگاروں کی صف سے نکال کر دنیا کے رزمیہ نگاروں میں داخل کردیا اور اردو ڈراما پر ایسی کتاب لکھی کہ جس سنگ میل کو اب تک اردو کی ڈرامائی ابتدا سمجھا جاتا تھا۔ وہاں پر آکر وہ کتاب ختم ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس محقق اور نقاد کی عظیم خدمتوں کو کبھی نہیں بھلایا جاسکے گا اور میری دعا ہے کہ رضوی ابھی مدتوں سلامت رہیں اور ایسے ایسے اور کارنامے انجام دیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب میرے استاد ہیں اور بحیثیت ایک استاد کے میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔ ان کی شفقت اور محبت کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ بحیثیت ایک ادبی محقق، ایک نقاد اور ایک ادیب کے بھی ان کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی انہی کاموں میں صرف کردی اور مختلف حیثیتوں میں ایسا کام کیا جس کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ انھوں نے اردو اور فارسی ادب کی جو نادر و نایاب کتابیں جمع کی ہیں وہ بھی ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایسے لوگ اب پیدا نہیں ہوں گے۔

یہ چند جملے آپ کی کتاب کے لیے ارسال کررہا ہوں جی یہ چاہتا ہے کہ اپنے استاد محترم کے بارے میں مفصل مضمون لکھوں لیکن افسوس ہے کہ جلد نہیں لکھ سکتا۔

صالحہ عابد حسین

میرا تعارف بزرگِ محترم جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب سے پہلے تو ان کی بلند پایہ تنقیدی اور تحقیقی تصانیف کے ذریعے ہوا جس سے میں بہت متاثر اور مرعوب ہوئی۔ اس کے بعد جب ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تو یہ محسوس ہوا کہ وہ بھی میرے خاندان کے بزرگ ہیں جو اپنی علمی، ادبی قابلیت کے علاوہ تہذیب و شرافت کا نمونہ ہیں اور وہ میرے ساتھ اس قدر عنایت اور شفقت سے پیش آئے کہ ان کے رعب کی جگہ انس و محبت نے لے لی۔

ان کے ادبی و علمی کاموں میں میں سب سے زیادہ متاثر ان خدمات سے ہوئی جو انھوں نے اردو مرثیہ خصوصاً میر انیس کو اردو دنیا سے روشناس کرانے اور انھیں ان کا صحیح مقام دلانے کے لیے کیں۔ انھیں کے فیضان سے مجھ میں یہ ہمت پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنے بساط بھر انیس پر کچھ کام کروں۔ جب میری کتاب 'خواتین کربلا۔ کلام انیس کے آئینے میں' شایع ہوئی تو مجھے ہر طرف سے داد ملی مگر مجھے سب سے زیادہ فخر اس خط پر ہے جو جناب مسعود حسن صاحب رضوی نے اسے پڑھ کر مجھے لکھا تھا۔ انھوں نے استحقاق سے زیادہ تحسین و تعریف سے نوازا۔ میں نے اپنی نئی تصنیف 'انیس سے تعارف' جو آج کل

پریس میں ہے) اس عقیدت و محبت کے اظہار کے طور پر جو مجھے جناب مسعود صاحب سے ہے، ان کے نام معنون کرنے کی جرات کی ہے!

خدا سے دعا ہے کہ وہ موصوف کو صحت عطا فرمائے اور ہم جیسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے زندہ سلامت رکھے۔ آمین

ڈاکٹر گیان چند

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اب تک اردو
کے بہت سے پروفیسر ہوئے ہیں۔ اگر کوئی ایزدی قوت مجھے
اختیار دے کہ میں اپنا تمام ذخیرۂ علم فراموش کرکے ان میں
سے کسی ایک کے جملہ علم کے برابر لے لوں تو میں محترم پروفیسر
سید مسعود حسن رضوی کے بے پایاں علم و فضل کا انتخاب کروں
گا۔ گو مسعود صاحب نے تنقید میں ہماری شاعری جیسی
اہم کتاب لکھی ہے لیکن ان کی بنیادی اہمیت محقق کی ہے۔
اردو میں تحقیق کے چار ستون کہے جاتے ہیں پروفیسر مسعود
حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی اور جناب مالک رام۔
مرحومین میں سے حافظ محمود شیرانی کا اضافہ کرلیا جائے تو اردو
تحقیق میں یہ پانچ نام سب سے اوپر تسلیم کیے جائیں گے اور
ان میں مسعود صاحب کسی سے پیچھے یا نیچے نہیں رہتے۔ نقوش
میں شائع شدہ اپنے مضمون تواز اور شکنتلا ناٹک میں انھوں
نے اپنے لائحۂ تحقیق پر روشنی ڈالی ہے اور اس سے بھی
زیادہ صراحت اپنے ایک خط[1] میں کرتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو: پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔ رسالہ تحریر۔ اپریل جون ۷۴ء،
سید مسعود حسن رضوی ادیب نمبر، ص ۹۵۔

"تحقیق کرنے والوں کے سامنے دو طریق کار ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کی غلطیاں نکالی جائیں اور ان کی غلط بیانیوں پر لے دے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اپنی بات ایسی مضبوط دلیلوں کے ساتھ کہی جائے جس سے غلط بیانیوں کی خود بخود تردید ہو جائے۔ دوسرے طریق کار کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرنے والے اہل نظر خال خال ہی ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے میں نے دوسرے ہی طریق کار کو اختیار کیا ہے جس کو تعمیری تحقیق کہنا چاہیئے۔"

مسعود صاحب تعمیری تحقیق کے بہترین نمائندہ ہیں۔ الحاقی، التباس آمیز، بکھرے ہوئے مواد کی بھول بھلیاں میں سے وہ جس ژرف نگاہی کے ساتھ معتبر حقیقتوں کو کھوج کر ایک لڑی کی شکل میں پیش کرتے ہیں اسے دیکھ کر ایک طرف منھ سے صدائے تحسین نکلتی ہے تو دوسری طرف عقیدت سے سر جھک جاتا ہے۔ اس طرزِ کار کی بہترین مثال ان کا شاہکار اردو ڈراما اور اسٹیج ہے۔ ابتدائی اور عوامی ناٹک کے مختلف روپوں کو وہ جس طرح چھان پھٹک کر تجزیہ کرتے آگے بڑھتے ہیں اس سے ہر شعبے، ہر اصطلاح اور ہر مبہم لفظ کا مفہوم متعیّن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اندرسبھا جیسی کتاب جس میں عوامی مقبولیت نے کیا کیا خلط ملط کر دیا تھا اور جس کے مصنّف کے بارے میں کیا کیا سچی جھوٹی روایات مشہور ہو گئی تھیں مسعود صاحب کے پیرِ بیضا میں آکر ایک تحقیقی دستاویز کی شکل اختیار

کو لیتی ہے۔

جناب رضوی کا حیطۂ کار بہت وسیع اور متنوع ہے۔ وہ محض مرثیے اور انیس کے گرد نہیں گھومتے بلکہ سلطان واجد علی شاہ کی حیات اور ادبی خدمات، امانت کے عوامی ناٹک، قائم دہلوی کے دیوان، رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عبرت، مبتلا کے تذکرہ گلشنِ سخن اور میرزا خان کے قواعد کلیہ بھاکا اور نہ جانے کن کن موضوعات پر کھوج کرتے ہیں۔ موضوعات کی اس رنگارنگی کے لحاظ سے وہ دوسرے کئی محققوں کے مقابلے میں ممتاز ہیں۔ ان کے تین ہیرو ہیں انیس، سلطان واجد علی شاہ اور محمد حسین آزاد۔ انیس اور مرثیے پر ان کا کام ہنوز مکمل نہیں ہوا۔ واجد علی شاہ کے بارے میں لہو ولعب کا جو عام تصور ہے مسعود صاحب اس کے برعکس اس تاجدار کو دوسری روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ واجد علی شاہ پر ان کا جو شاہکار پیش ہونے والا ہے مجھے امید ہے کہ وہ ان کے عقیدے کی سند ٹھہرے گا۔ آزاد کو جس شد و مد سے انھوں نے معتبر محقق ثابت کرنا چاہا ہے ہزار احترام کے ساتھ اس سے اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔

معلوم نہیں کیوں بعض حضرات مسعود صاحب کو سست قلم کہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں جس مقدار کا تحقیقی کام پیش کیا ہے دوسرے کب کرسکتے ہیں۔ اتنی کتابوں اور اس معیار کی کتابوں کے مصنف کو

کس طرح سست قلم کہہ سکتے ہیں۔ آخر تحقیقی کام لکھنا انشائیہ یا شخصی یادداشتیں لکھنا نہیں ہے۔ مسعود صاحب کے مجموعی کام ایسے ہیں جو ایک فرد سے نہیں ادارے سے ممکن ہو سکتے تھے۔ ان کا ادبستان ہے بھی ایک ادارہ جس سے نہ معلوم کتنے پیاسے فیض حاصل کرتے ہیں۔ میں نے ان کے کتبخانے کو دیکھا نہیں لیکن اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں شوکت تھانوی نے شیش محل میں لکھ دیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کو دوسروں کی نگاہوں سے بچا کر رکھتے ہیں۔ میں نے تو جب چاہا انھوں نے کھلے دل سے کتابیں نہ صرف دکھائیں بلکہ میرے مفید مطلب مواد تلاش کر کے مجھے دیا۔ اس لطف خاص کا شکریہ کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کتب خانے میں وہ بیش بہا گوہر بلکہ جواہرات ہیں کہ اردو کی حد تک رضا لائبریری کے علاوہ ملک کا کوئی کتب خانہ اس کا حریف نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک تن تنہا فرد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کتنا زرِ کثیر صرف کیا ہوگا۔ ہم لوگ جو کتابیں خریدنے کے چور ہیں اس خزینے کو شرم اور فخر کے ملے جلے جذبات سے دیکھ سکتے ہیں۔

مسعود صاحب بہت اچھے متکلم کار ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنے کا جب کبھی شرف ملتا ہے وہ گھنٹوں بات چیت کرتے رہتے ہیں اور موضوع سخن ہمیشہ اردو ادب ہوتا ہے۔ اس گفتگو سے ہر لمحے مخاطب کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کمال یہ ہے کہ گھنٹوں کی بے بے محابا بات چیت کے دوران وہ نہ کسی کی غیبت کریں گے نہ کسی کے بارے میں ایسی بات کہیں گے جو اس تک پہنچا دی جائے تو آبگینے کو ٹھیس لگ جائے۔ انھیں کسی سے کیا لینا دینا ہے اس لیے انھیں کسی لگائی بجھائی کی ضرورت نہیں۔ اردو زبان کی شستگی اور نوک پلک کا اندازہ کرنا ہے تو ان کی گفتگو سنتے جائیے۔ لفظوں کی دروبست، زیر وبم اور فقروں کے توازن و ترنم کا لطف لیا کیجئے۔ ان کی رطب اللسانی کو سن کر اہل لکھنؤ کی قدرتِ زبان پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

کئی سال قبل ایک بار محترم نے مجھ سے شکوہ کیا کہ اردو دنیا نے ان کی قدر نہیں کی، ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ میں نے حیرت کے ساتھ کہا کہ ہر شخص تو آپ کے مقام کی رفعت کا معترف ہے۔ اس پر موصوف نے فرمایا کہ تخلیق فن کاروں بلکہ نقادوں کی طرف بھی جو توجہ کی جاتی ہے وہ اس سے محروم رہے ہیں۔

ٹھوس اور سنجیدہ کام کرنے والے کچھ نہ کچھ تو گھاٹے میں رہتے ہی ہیں۔ اردو دنیا کی بے توفیقی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اب "تلافیِ مافات" ہوگئی ہے اور اب ایسا شکوہ نہیں کیا جاسکتا۔ مالک رام جیسے محقق کے رسالے تحریر نے انھیں ایک خاص نمبر کے ذریعے خراج تحسین پیش کیا اور اہلِ لکھنؤ ایک خاص تقریب میں انھیں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے والے ہیں۔

قبلہ سید مسعود حسن رضوی تاریخِ ادب کے میدانِ ظلمات میں روشنی کے بلند مینار ہیں، برگد کا چھتنار درخت ہیں۔ اب ایسے دیوقامت ادیب کہاں ہوتے ہیں۔ خدا انھیں صدہا سی سال تک ہمارے درمیان رکھے تاکہ وہ اپنے کارناموں کی تکمیل سے مجھ جیسے کم سوادوں کی بصیرت میں اضافہ کرتے رہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

مسعود حسن رضوی ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں انھوں
نے ادب اور تحقیق کے مطالعے میں اور اس مطالعے کے نشے
میں زندگی گزاری ہے یہ نشہ بھی تھا نجات بھی اس سرشاری
میں انھوں نے نہ جاہ و منصب کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھا
نہ شہرت اور اشتہار کی پروا کی۔ لکھنؤ کے شاہی اور عوامی
اسٹیج پر ان کی تصنیف کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا لیکن
ان کے لیے زیادہ اہمیت اہلِ علم کی قدر دانی کی تھی جنھوں
نے متفق اللفظ ہوکر یہ تسلیم کیا کہ اس کتاب نے ادبی تاریخ
میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے گو ان میں سے بہت
کم کو یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تصنیف بیس سال کی مسلسل عرق
ریزی کا نتیجہ تھی۔ 'ہماری شاعری' نے اردو تنقید کے لب
لہجے کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی مثالیں بہت کم ہیں
'ہماری شاعری' میں پہلی بار اردو شاعری اور بالخصوص اردو
غزل کی علامات کی تہہ داری، لہجے کی بلاغت اور اندازِ بیان
کی جامعیت پر روشنی ڈالی گئی اس نے اردو شاعری کو نیا
احترام بخشا یہی حال مرثیے کے بارے میں ان کی تصانیف کا

بھی ہے اردو مرثیے پر جتنی گہری نظر ان کی ہے وہ کسی
اور کو میسّر نہیں، ان کی بیش بہا تصانیف سے قطع نظر مسعود
حسن رضوی ادب کے راہیوں کی اس نسل کے شاید آخری مصنف
ہیں جو طہارتِ الفاظ اور قطعیتِ اظہار کے شیدائی ہیں۔ فلابیر
کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے مادام بواری ناول
میں بارش کا منظر انیس بار لکھا تھا مسعود صاحب کے لا انداز
مسودات جنھوں نے دیکھے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ الفاظ کے
صحیح اور قطعی (EXACT) استعمال کے سلسلے میں مسعود
صاحب فلابیر سے کم محتاط نہیں۔

مسعود صاحب ان ادیبوں میں ہیں جن کے لیے علم و
ادب پوری زندگی ہے، مطالعۂ ادب اور ادبی تحقیق جس قسم کے
ڈسپلن اور ضابطہ بندی کا مطالبہ کرتے ہیں مسعود صاحب نے پوری
زندگی اسی طرز میں گزاری ہے ان کا کوئی جملہ کلاسیکی ضبط و نظم
سے منحرف نہیں ہوتا، ان کی کوئی حرکت "خفیف الحرکاتی" کے
دائرے میں نہیں آتی، ان کی پوری زندگی، اٹھنا بیٹھنا، لباس و
پوشاک، انسانی تعلقات، طرزِ گفتگو سب کچھ اسی شائستگی کا نمونہ
ہے جس کا مطالبہ وہ ادب میں کرتے ہیں ایسے پاک طینت
اور صاف باطن اب مدتوں سے نایاب ہیں انھیں کے لیے
گویا میر نے کہا تھا کہ فلک برسوں پھرتا ہے، تب خاک
کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔

مسعود صاحب ایک شفیق استاد اور شریف النفس

انسان ہیں۔ جن لوگوں کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے وہ ہمیشہ ان کے تبحر علمی اور ان کے دل کش طرز تخاطب کو یاد رکھیں گے، مسعود صاحب اپنی نجی گفتگو میں بھی ہر لفظ کو صحیح موقعے پر اور صحیح تلفظ کے ساتھ صرف کرنے کے عادی ہیں چاہے کلاس لیکچر ہو یا بے تکلف گفتگو، ان کے ہاں الفاظ کی صحیح نحوی ترتیب باقی رہتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے ان کے ذہن میں ایک ایک حرف پہلے سے مرتب اور مربوط شکل میں موجود تھا۔

زبان اور محاورے کے رموز و نکات پر ان کی نظر گہری ہے ان سے جب بھی ملاقات ہوگی سننے والا ضرور کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھے گا کسی لفظ کا صحیح تلفظ یا اس کا صحیح محل استعمال، تحقیق کا کوئی نیا نکتہ یا تنقید کا کوئی نیا پہلو سامنے آئے گا۔ مسعود صاحب کو اصرار ہے کہ انگریزی الفاظ DENY اور REFUSE میں فرق کرنا چاہیے پہلے کا ترجمہ "سے انکار" اور دوسرے کا ترجمہ "کا انکار" سے ہونا چاہیئے مثلاً اس نے یہ کام کرنے سے انکار کیا HE REFUSED TO DO THIS JOB اور اس کا خدا کے وجود کا انکار کیا HE DENIED THE EXISTENCE OF GOD اسی طرح وہ باتوں باتوں میں ٹوک دیں گے کہ 'علاوہ ازیں' صحیح نہیں ہے 'علاوہ بریں' کہنا چاہیے علاوہ دراصل اس چھوٹے بوجھ کو کہتے ہیں جو کسی بڑے بوجھ پر رکھا ہو یا جوش ملیح آبادی

کو ان کے مصرعے "رواں دواں بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو" پر یہ کہہ کر ٹوک دیں گے کہ 'رواں دواں' کے نیچے یہ نوٹ دینا ضروری ہے کہ یہاں یہ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے محاورے کے معنوں میں نہیں۔ محاورے میں 'رواں دواں' کے معنی ہیں ایسا شخص جس کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو۔ صفی لکھنوی نے یتیموں پر اپنی نظم میں ان کی زبان سے کہلوایا ہے

رواں دواں ہیں غریب الدیار ہیں ہم لوگ

یا مجازؔ کو چپکے سے بتادیں گے کہ "وہ زخمی سوفار مژگاں نہیں ہیں" صحیح نہیں، سوفار سے کوئی زخمی نہیں ہوتا وہ تیر کے پیچھے کا حصّہ ہوتا ہے جو پیکاں کے زخم کو چوڑا کرنے کے کام آتا ہے۔

غرض مسعود صاحب کی ذات زبان و ادب کے لیے ہی نہیں تہذیب اور شائستگی کے لیے مینارۂ نور ہے انھیں صدوسی سال کی عمر عطا ہو اور ان کی ذات گرامی سے ہمارے سماج میں خیر و برکت کے نئے خزینے ارزانی ہوں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو کی ان بزرگ اور برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن کی تحقیق کا لوہا سب مانتے ہیں۔ ان کی نگارشات نے ہماری معلومات کے افق کو وسیع کیا ہے، اور حقائق کے کئی نئے باب وا کیے ہیں۔ اردو کی کلاسیکی شاعری کے بارے میں جو غلط فہمیاں مدتوں سے چلی آرہی تھیں، انھیں مسعود حسن رضوی صاحب نے "ہماری شاعری" میں دور کیا۔ کئی نسلوں تک یہ کتاب ہماری تنقید کے راستے کا چراغ رہی ہے۔ "آئینۂ سخن فہمی" اور "فرہنگِ امثال" لکھ کر انھوں نے زباں دانی کا حق ادا کیا ہے، اور اردو رسم الخط پر اس زمانے میں قلم اٹھایا جب دیوناگری کی بحث زوروں پر تھی۔ انھوں نے علمی دلائل سے ثابت کیا کہ سائنٹفک رسم الخط کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ آبِ حیات کی تحقیقی غلطیوں کے بارے میں ردِعمل کے طور پر جو مفروضات قائم کرلیے گئے تھے، مسعود حسن رضوی صاحب نے ان کو بھی بے نقاب کیا۔ ان کی تحقیق کے خاص میدان انیسؔ، واجد علی شاہ اور ان کا عہد ہیں۔ اردو تھیٹر کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ امانت کی اندرسبھا کی بحث انھوں نے بہت پہلے رسالہ اُردو

میں اٹھائی تھی۔ بعد میں اپنی تحقیقات کے بچوڑ کے طور پر انھوں نے لکھنؤ کا شاہی اسٹیج اور لکھنؤ کا عوامی اسٹیج دو معرکتہ الآرا کتابیں شائع کیں۔ واجد علی شاہ پر ان کی کتاب جو ان کی برسوں کی محنت اور کوشش کا ثمرہ ہے، منظر عام پر آرہی ہے۔ کلام انیس کے شاعرانہ حسن، اس کی آفاقیت اور عظمت کا احساس عام کرانے میں بھی پروفیسر مسعود حسن رضوی کی خدمات اور ان کی مرتبہ کتابوں' رزم نامہ انیس اور شاہکار انیس کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے ذاتی تلاش و جستجو سے سینکڑوں قدیم نوادر جمع کیے ہیں اور تاریخ ادب اردو کی متعدد گم شدہ کڑیاں لائی ہیں۔ اردو تحقیق میں ان کی حیثیت روشنی کے مینار کی سی ہے۔ خدا انھیں تادیر سلامت باکرامت رکھے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اردو زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے جن اساتذہ کی تحریروں سے زیادہ سے زیادہ روشنی اور رہنمائی حاصل کرنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا نام میرے لیے بے حد واجب الاحترام ہے نہ صرف اس لیے کہ میں موصوف کے علمی مزاج اور ادبی ذوق سے متاثر رہا ہوں بلکہ اس لیے بھی کہ مسعود صاحب کی زندگی کی کہانی میں میری روداد حیات کا بھی ایک حصّہ شامل نظر آتا ہے۔

اردو شاعری کی مزاج دانی اور مشرقی ادبیات کی اقدار شناسی میں پروفیسر صاحب موصوف کو جو غیر معمولی درک حاصل ہے اس نے اردو شاعری پر تنقید کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اردو زبان کے انتقادیں ہماری شاعری کو ایک میزان قدر اور محک اعتبار کا درجہ دیا جاسکتا ہے، اگر موصوف اپنی زندگی میں یہی ایک کتاب لکھتے تو بھی اردو ادبیات کی تاریخ میں مقدمہ شعر و شاعری کے ساتھ اس کی جگہ محفوظ ہوتی۔

موصوف کی علمی خدمات اور ادبی فتوحات کا سلسلۃ الذہب نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں دید و دریافت اور فکر و نظر کا وہ اعلیٰ معیار موجود ہے جو کسی بھی زبان اور اس کی علمی و ادبی فتوحات کے لیے وجہ افتخار ہوسکتا ہے۔ جامعیت کا تصور ہماری زبان و ادب کی تاریخ میں چند گنے چنے افراد ہی کے ساتھ وابستہ کیا جاسکتا ہے اور ان میں پروفیسر صاحب موصوف کا نام بہت ممتاز ہے۔ مسعود صاحب کی تحقیقات علمیہ اور تنقیدات عالیہ کا دائرہ قوس قزح کی طرح ہفت رنگ ہے۔ اسی کے ساتھ، مطالعہ کی وسعت مشاہدہ کی گہرائی اور اس درجہ پر اہتمام تلاش جزئیات کے ساتھ اس نوع کی سلامت روی کے نمونے جو مسعود صاحب کی تحریروں کا وصف خاص ہے چیدہ و چنیدہ افراد میں بہت کم ملینگے۔

پروفیسر رضوی ہمارے ان چند لکھنے اور پڑھنے والوں میں سے ہیں عمر کے ساتھ ساتھ جن کے مطالعہ کی تازگی اور تحریر کی تابناکی بڑھتی رہی۔ میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے سلسلہ میں وائیوا کے لیے جب موصوف علی گڑھ تشریف لائے تھے تو اس وقت مجھے یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ موصوف نے "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" اپنے اس شعر اور دستخط کے ساتھ مجھے مرحمت فرمایا تھا۔

کچھ عجب حالت ہے راہِ منزلِ مقصود کی جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

یہ شعر اس ذوق و شوق اور وجد و حال کا ترجمان ہے جس

کے ساتھ موصوف کا ہر قدم راہِ طلب میں بڑھتا چلا گیا۔

پروفیسر رضوی کے پاس نادر و نایاب مخطوطے اور بیش قیمت نسخے صدہا نہیں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس متاعِ دین و دانش کی فراہمی حفاظت اور مطالعے میں موصوف نے اپنی عمرِ عزیز اور نیک کمائی کا بہت بڑا حصّہ صرف کیا ہے اور اس طرح گزشتہ لکھنؤ کے اس تہذیبی ورثہ کو مکمل تباہی سے بچا لیا ہے جو بہ صورت دیگر معلوم نہیں کہاں جاتا اور کن ہاتھوں میں پہنچتا۔ اس علمی سرمایہ کی جمع آوری کسی بھی انسان کے لیے بڑے عزّ و شرف کی بات ہوسکتی ہے اور موصوف نے اپنے علمی جذب و جنوں کے سہارے ان کا مطالعہ کرکے اور حاصلِ مطالعہ کو اعلیٰ تہذیبی اور تصنیفی سطح پر کام میں لاکر بے حد نتیجہ خیز اور ثمر آفریں بنا دیا ہے۔

پروفیسر صاحب موصوف کی زندگی میں بے شمار کتابوں کے ساتھ ان گنت طالب علم شریک رہے ہیں، جن میں وہ ممتاز افراد بھی ہیں جو آج اردو تحقیق تنقید اور تدریس کی دنیا کے صدر نشین ہیں وہاں ایسے افراد اور اشخاص بھی ہیں جو براہِ راست مسعود صاحب کے حلقۂ سخن میں زیرِ تربیت نہیں رہے لیکن دور رہ کر بھی انھوں نے موصوف کی شخصیت و شعور اور ان کے علمی آثار سے حسبِ استعداد و توفیق استفادہ کیا ہے اس طرح مسعود صاحب نے صرف کسی ایک نسل کو نہیں کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے ایک استاد کی زندگی کے لیے اس سے بہتر کامیابی

اور سعادت کی کیا بات ہوسکتی ہے۔

میری ملاقات موصوف سے زندگی میں صرف دو بار ہوئی ہے لیکن پندرہ برس سے مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ اس اثنا میں برابر سلسلۂ مراسلات قائم رہا اور مجھے ہمیشہ موصوف نے "عزیز مکرم" سے یاد فرمایا اور اپنے دست مبارک سے خط لکھا۔ ایک بار میں نے اپنے نیاز نامہ کو "ڈیر سر" کے القاب کے ساتھ شروع کیا تو اس کے جواب میں موصوف نے تحریر فرمایا اس انداز تخاطب سے میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ یہ خط آپ کا نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسعود صاحب کو مشرقی آداب اور عوائد رسمیہ کس قدر عزیز ہیں اور ان کی میزان قدر میں تہذیبی اقدار کو کیا درجہ حاصل ہے۔ ۱۹۴۲-۴۳ء میں جب میں اساتذۂ اردو جامعات ہند کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لکھنؤ حاضر ہوا تو ایک دن اور ایک رات پروفیسر موصوف کے یہاں مہمان رہا اس وقت دولت حضوری کے علاوہ مجھے قدم قدم پر اس کا احساس ہوا کہ مسعود صاحب اپنے ادنیٰ نیاز مندوں کے ساتھ بھی کس قدر مخلصانہ شفقت اور کریمانہ اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں اتنا کہ آدمی خود کو شرمندہ احسان محسوس کرنے لگے، رات گئے تک کمزور اور صاحب آزار ہونے کے باوجود مجھ سے گفتگو فرماتے رہے۔ لکھنؤ کی تہذیب، زبان، ادب، تاریخ اور تاریخی شخصیتوں سے متعلق بہت سے ایسے پہلو اور نکتے سامنے آئے جن کو

حاصل مطالعہ کہا جاسکتا ہے۔

ذوق مرحوم نے اپنے ایک شعر میں کسی "ہمدم دیرینہ" کے ملنے کو ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر کہا ہے میں اسے "مشفق دیرینہ" سے بدل کر شعر کو یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں

اے ذوق کسی مشفق دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

موصوف نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور ہم وابستگان اردو ان سے اور زیادہ کی توقع رکھتے ہیں خدا پروفیسر موصوف کے سایہ کو اردو اور اردو والوں کے سر پر قائم رکھے۔ آمین۔